ڈاکٹر اسد فیض کی تحقیقی اور تنقیدی خدمات کا جائزہ

﴿مقالہ برائے ایم۔فل اُردو﴾

مقالہ نگار:
رخشندہ کوثر

نگران:
محمد خالد فیاض الرحمٰن

رول نمبر:**11106**

جناح کالج آف ایجوکیشن گجرات
سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

ڈاکٹر اسد فیض کی تحقیقی اور تنقیدی خدمات کا جائزہ

یہ مقالہ ایم۔فل کی جزوی تکمیل کے سلسلے میں جناح کالج، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا کو سند عطا کیے جانے کے لیے پیش کیا گیا۔

ایم۔فل (آرٹس)

مضمون

اُردو

نام: رخشندہ کوثر

رول نمبر:11106

جناح کالج آف ایجوکیشن گجرات

سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

تصدیق برائے تکمیل مقالہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ زیرِ نظر مقالہ بعنوان

ڈاکٹر اسد فیض کی تحقیقی اور تنقیدی خدمات کا جائزہ

رخشندہ کوثر رول نمبر 11106 ایم۔فل اُردو کی جزوی تکمیل کے لیے تدریسی مدت میں میری زیرِ نگرانی مکمل کیا گیا۔

تاریخ:................

نگران مقالہ:

محمد خالد فیاض الرحمٰن دستخط:.....................

ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبۂ اُردو

گورنمنٹ زمیندار پوسٹ گریجوئیٹ کالج، گجرات

پروفیسر ڈاکٹر سید عامر سہیل

صدر شعبۂ اُردو

سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

کنٹرولر امتحانات

سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

اقرار نامہ

میں رخشندہ کوثر رول نمبر 11106 ایم۔فل (اُردو) میقات ۲۰۱۴۔ ۲۰۱۶ء اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ مقالہ میں پیش کیے جانے والا مواد بعنوان ''ڈاکٹر اسد فیض کی تحقیقی اور تنقیدی خدمات کا جائزہ'' میری ذاتی کاوش ہے اور یہ کام پاکستان یا پاکستان سے باہر کسی بھی تحقیقی یا تعلیمی ادارے کی طرف سے شائع، طبع یا پیش نہیں کیا گیا۔

دستخط مقالہ نگار

رخشندہ کوثر

تاریخ:..................

انتساب

اپنے شوہر غلام مصطفیٰ

اور

اپنے بچوں

ایمان مصطفیٰ، عبدالرحمٰن مصطفیٰ اور محمد عبداللہ مصطفیٰ

کے نام

فہرست عنوانات

باب چہارم:

پیش لفظ

ڈاکٹر اسد فیض اُردو دنیا کے ایک اہم محقق اور نقاد ہیں جن کے علمی اور ادبی کاموں کو بلاشبہ اُن کے معاصرین انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اسد فیض نے تحقیق کے میدان میں بہت اہم اضافے کیے جن کا اعتراف کرنا ضروری تھا۔ اس لیے اس مقالہ کو اُن کی تحقیقی اور تنقیدی خدمات کے جائزہ کے لیے تحریر کیا گیا ہے۔

ہمارے ہاں جینوئن ادیبوں اور محققین کی شدید کمی ہے ایسے میں ڈاکٹر اسد فیض کی ہستی کسی نعمت سے کم نہیں۔ اُن کی دس سے زائد کتب، پچاس سے زائد مقالات اور بے شمار دیگر ادبی اور تحقیقی تحریریں شائع ہو چکی ہیں۔ مقالہ کے لیے اُن کا انتخاب اسی علمی سرمایہ کی وجہ سے ہے۔

پہلے باب کو ڈاکٹر اسد فیض کی زندگی اور اُن کے ادبی مشاغل اور تصانیف کے جائزہ کے لیے مختص کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں ڈاکٹر اسد فیض کی اقبال شناسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ انہوں نے اقبالیات کے موضوع پر خصوصی تحقیق کی جس کی علمی دنیا میں ایک الگ ہی اہمیت بنتی ہے۔ لہٰذا اس باب میں اُن کی اسی تحقیق پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرا باب ان کی منٹو شناسی کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ سعادت حسن منٹو اور سعادت حسن منٹو پر تحقیق؛ ڈاکٹر اسد فیض کا خاص تحقیقی میدان ہے جس میں اُن کی صلاحیتوں کا لوہا بڑے بڑوں نے تسلیم کیا ہے۔ اس وقت اُردو دنیا میں منٹو پر کام کرنے والے چند اہم ترین محققین میں ڈاکٹر اسد فیض کا شمار ہوتا ہے۔ کیوں کہ انہوں نے اس میدان میں گراں قدر خدمات سر انجام دی ہیں۔ تیسرے باب میں اُن کی انہی خدمات کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔

چوتھے باب میں ڈاکٹر اسد فیض کی دیگر تحقیقی اور تنقیدی تحریروں کا محاکمہ کیا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کی تحقیق کا دائرۂ کار کس قدر وسیع ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اُن کی تمام جہات کا احاطہ اس باب میں کیا جائے۔

آخر میں ''ماحصل'' کے عنوان سے ڈاکٹر اسد فیض کی مجموعی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اس تحقیق کی بنیاد پر سامنے آئی ہے۔ اور بلا شبہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر اسد فیض کی تحقیق اور تنقید ادبی سطح پر کسی سرمایے سے کم نہیں۔

اس مقالہ کی تیاری میں محمد ابو بکر فاروقی اور بو علی منور صاحب کی خصوصی معاونت رہی جنھوں نے مواد کی فراہمی میں بر وقت مدد کی اور انتہائی شفقت فرمائی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر مظہر عباس اور ڈاکٹر سیدہ عطیہ خالد کی معاونت بھی رہی۔

اپنی دوست اور کلاس فیلو سدرہ نوازش، فوزیہ بی بی اور رمیض شاہ کی بھی ممنون ہوں جنھوں نے میرے ساتھ میرے کام کے حوالے سے کئی اہم مکالمے کیے اور مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ ان کے ساتھ پہروں کی نشستیں رہیں جن کے حاصلات ان صفحات میں درج ہوئے ہیں۔

پروفیسر سید عامر شاہ اور پروفیسر علی عدنان کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے کہ جن کی وجہ سے آج مجھے یہ مقالہ مکمل کرنے کا اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔ ان کی خصوصی شفقت اور ڈانٹ ڈپٹ نے مجھے بہت حوصلہ دیا۔

اپنے والدین اور اپنے شوہر کا بھی شکریہ ادا کرنا بہت ضروری ہے کیوں کہ میں آج جو کچھ بھی ہوں اُنھی کی وجہ سے ہوں۔ اس مقالہ کے دوران اُنھوں نے میرے لیے بہت آسانیاں پیدا کیں اور مجھے وہ تمام وسائل فراہم کیے جو ضروری تھے۔

آخر میں، میں سب سے زیادہ ممنون اپنے نگران محترم پروفیسر محمد خالد فیاض الرحمٰن صاحب کی ہوں

جن کی بدولت یہ مقالہ تحریر کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اُن کے ساتھ کام کرتے ہوئے انسان کا بس کام کرتے رہنے کو ہی جی چاہتا ہے اور اگر کام تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کا ہو تو پھر کام کی تکمیل تک چین محال ہے۔ مجھے اُنہوں نے اس دوران مسلسل کام پر لگائے رکھا جس کے لیے میں اُن کی ممنون ہوں۔

رخشندہ کوثر

بابِ اوّل:

ڈاکٹر اسد فیض: شخصیت اور سوانح

سوانحی حالات اور خاندانی پس منظر:

ڈاکٹر اسد فیض کے ابا و اجداد قیام پاکستان سے قبل دھوگڑی ضلع جالندھر انڈیا میں مقیم تھے ۔یہ گاؤں جالندھر کے مضافات میں واقع ہے۔اُن کا تعلق ارائیں خاندان سے ہے۔جو زراعت پیشہ تھے لیکن ان کے دادا فضل محمد (۱۹۰۳۔۱۹۴۲ء) خاندان میں پہلے آدمی تھے جنہوں نے سرکاری ملازمت اختیار کی۔وہ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۲ء تک انڈین ریلوے سروس میں ملازم رہے ۔ اس دوران اُن کی تعیناتی لاہور ریلوے ورکشاپ اور جالندھر میں رہی۔ فضل محمد کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ طفیل محمد اور فیض محمد جبکہ بیٹی کا نام انور سلطانہ ہے۔ طفیل محمد(۱۹۳۱۔ ۱۹۹۲ء) جالندھر میں پیدا ہوئے(۱)۔ اپنے گاوں دھوگھڑی میں آٹھویں جماعت تک زیر تعلیم رہے۔ میٹرک الاول پور اور انٹر میڈیٹ گورنمنٹ اسلامیہ کالج جالندھر سے کیا۔ انہوں نے میکلگن انجینئرنگ کالج لاہور سے الیکٹریکل میں ڈپلومہ کیا۔ قیام پاکستان سے قبل وہ دہلی میں ملازم تھے(۲)۔ قیام پاکستان کے موقع پر انہوں نے پاکستان میں ملازمت کو ترجیح دی اور اس طرح وہ دہلی سے لاہور منتقل ہوگئے۔ جہاں سے انھیں کچھ عرصہ کے بعد راولپنڈی ٹرانسفر کردیا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں وہ پاکستان کو مستقل طور پر خیر باد کہہ کر برطانیہ منتقل ہوگئے۔(۳) جہاں انہوں نے بیرونی دنیا میں قران پاک کے فروخت کے حوالے سے ایک ادارہ قران ایکسپورٹ اینڈ امپورٹ بنایا وہ پہلے مانچسٹر اور بعد ازاں لیڈز میں مقیم رہے۔ انہوں نے ۱۹۹۲ء میں وہیں وفات پائی اور لیڈز کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔(۴) ان کی ایک ہی بیٹی سعدیہ طفیل ہے جو لیڈز ڈسٹرکٹ پولیس میں بہ حیثیت ڈاکٹر تعینات ہیں۔ اُن کی شادی لیڈز یونیورسٹی کے ایک نومسلم پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر سے ہوئی ہے اور ان کا ایک بیٹا ہے۔ فضل محمد کے دوسرے بیٹے فیض محمد ۱۹۳۴ء کو دھوگڑی (جالندھر) میں پیدا ہوئے۔(۵) قیام پاکستان کے وقت وہ نویں جماعت کے طالبعلم تھے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون ''میں نے پاکستان بنتے دیکھا'' میں لکھا ہے:

''اس واقعہ کو پچاس برس گزر چکے ہیں لیکن آج بھی شب گزشتہ کی طرح

سب کچھ یاد ہے۔ ہجرت کے اس سفر نے زندگی کے تمام راستے اور
خواب بدل ڈالے تھے بچپن کے دن ،میرے گاؤں کی گلیاں اور مانوس
چہرے یہ سب میں کبھی نہیں بھول سکتا۔''(۶)

ستمبر۱۹۴۷ میں دھوگڑی جالندھر سے اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ دس دن پیدل چل کر فیض محمد لاہور پہنچے، فاقے، جتھے کے حملے کا خطرہ ، سیلاب ، قدم قدم پر موت کا سامنا رہا۔لیکن بلا آخر امیدوں اور خوابوں کی سرزمین پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔جہاں والٹن کیمپ میں ٹھہرے ۔بعد ازاں اپنے عزیز و اقارب کی تلاش میں نکلے اور اوکاڑہ میں ان کی اطلاع پا کر وہاں چلے گئے جہاں ان کی خالہ اور نانی بھی پہنچ چکی تھیں۔فیض محمد نے بعد ازاں ایم بی ہائی سکول اوکاڑہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیااور پاکستان ریلوے میں بکنگ کلرک کے طور پر ملازم ہوگئے۔(۷) ابتدا میں ٹاٹے پور اور ملتان میں تعینات رہے۔ ۲۲ اپریل۱۹۵۸ء کو فیض محمد کی شادی اپنی چچا زاد کنیز اختر کے ساتھ خانیوال میں انجام پائی۔(۸) بارات اوکاڑہ سے آئی تھی۔ فیض محمد کچھ عرصہ ملتان میں تعینات رہ کراور ترقی پا کر ریلوے گارڈ ہوکر سمہ سٹہ چلے گئے ۔ سمہ سٹہ بہاولپور سے دس کلومیٹر کی مسافت پر کراچی جانے والی مین لائن پر واقع ایک چھوٹا ساشہر اور ریلوے کا ایک بڑا جنکشن ہے جہاں سے بہاول نگر اور پاکپتن کے لئے ٹرینیں روانہ ہوتی تھیں۔ اس وجہ سے اس کی زیادہ تر آبادی ریلوے ملازمین پر مشتمل تھی۔ یہاں وہ تیس سال مقیم رہے۔ ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ اسد فیض اُن کے بڑے بیٹے ہیں۔ وہ ۲۲ اپریل ۱۹۶۲ء کو فیصل آباد میں پیدا ہوئے(۹) جہاں ان کا ننھیال ہے۔ اسد فیض کے دو چھوٹے بھا ئی آصف فیض(پ ۱۹۶۷ء) اور عاصم فیض (پ ۱۹۷۲ء) ہیں۔اور ان کی ایک بہن فوزیہ فیض(۱۹۶۳ء) نے اپنا بچپن یہیں بسر کیا۔ سمہ سٹہ میں دو ہائی سکول تھے ایک گورنمنٹ ہائی سکول اور دوسرا ریلوے ہائی سکول سمہ سٹہ، گھر کے قریب ہونے کی وجہ سے اسدفیض ابتدا میں گورنمنٹ ہائی سکول کے طالبعلم رہے وہاں وہ تعلیم کے علاوہ تقریری مقابلوں اور کھیلوں میں نمایا ں رہے۔ اسی دوران ساتویں آٹھویں کلاس میں یہیں انہوں نے بچوں کی کہا نیا ں لکھنے کا آغاز کیا۔ سمہ سٹہ میں جن لوگوں سے ان کی دوستیاں رہیں، اُن میں سے کچھ کا تعلق صحافت سے بھی تھا۔ سلیم اختر سمہ سٹہ کے سینئر صحافی تھے اور روزنامہ امروز ملتان سے وابستہ تھے۔ اسد فیض کے والد سے ان کی دوستی تھی۔ اس کے علاوہ طلبا سیاست میں متحرک ایک نوجوان سلیم اقبال سے بھی اسد فیض کی جان پہچان رہی جو بعد ازاں صحافت سے وابستہ رہے۔ ان کے ایک اور دوست افتخار احمد علوی بھی

بہاولپور کے علاقائی اخبار کے لئے نامہ نگار کے طور پر کام کرتے تھے۔ ایس ای کالج کے طالب علمی کے زمانے میں شہاب دہلوی کے صاحب زادے شاہد حسن رضوی اسد کی سینئر کلاس کے طالب علم تھے ۔ ان کے گھر سے ہفت روزہ الہام بہاول پور شائع ہوتا تھا۔ اسد دوستوں کے ساتھ ان کے گھر جاتے اس میل ملاپ کے بعد ان کی کچھ ابتدائی تحریریں شہاب دہلوی کے ہفت روزہ الہام بہاولپور میں بھی شائع ہوئیں۔ اسد فیض کے والد ۳۰ اپریل ۱۹۸۸ء کو ملازمت سے ریٹائر ہوگئے اور مستقل طور پر ملتان شفٹ ہوکر وہیں آباد ہوگئے(۱۰)۔ وہ ہر ماہ ہزاروں میل ٹرین کا سفر کرتے تھے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں اسلحہ سے بھری ٹرین کو بہاولنگر کے جنگ زدہ علاقے میں لے کر جانے اور اپنے فرائض جرات و بہادری سے انجام دینے پر پاکستان ریلوے نے انھیں تعریفی اسناد سے بھی نوازا۔(۱۱) وہ بھی ادب کا ذوق و شوق رکھتے تھے۔طالب علمی کے زمانے میں اوکاڑہ میں ادبی محافل میں جانا اور مختلف اخبارات و رسائل کے لئے مضامین تحریر کرنا اُن کا مشغلہ تھا۔(۱۲) اس طرح ادب سے اسد فیض کا لگاؤ اور وابستگی ان کو ورثے میں ملی۔جس کو انہوں نے اپنی ذاتی کوشش اور کاوش سے نکھارا اور پروان چڑھایا۔

ملازمت:

اسدفیض نے اپنی ملازمت کا آغاز واہ بوفرزکیمیکل واہ کینٹ سے کیا جہاں وہ تین سالہ ڈپلومہ آف ایسوسی ایٹ انجینیر (کیمیکل) پاس کرنے کے بعد چارج مین کوالٹی کنٹرول کے طور پر فروری ۱۹۸۵ء مں تعینات ہوئے۔(۱۳) یہاں وہ ایک برس ہی رہے۔ فیکٹری کا ماحول انھیں پسند نہ آیا۔ اس دور میں راول پنڈی کے اردو بازار میں انہوں نے جو پہلی کتاب مطالعہ کے لئے خریدی، وہ مقدمہ شعرو شاعری تھی۔ وہ آج تک نہیں سمجھ سکے کہ کیاقدرت ان کے لئے مستقبل کی راہیں منتخب کر چکی تھی۔ ملازمت ترک کرکے واپس سمہ سٹہ آکر ایک برس وہ گھر پر لکھنے پڑھنے کی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ ان کے ایک دوست کے ماموں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں لائبریرین تھے ۔وہ وہاں جا کر کتب بینی میں مصروف رہتے اور باقی ماندہ کتب گھر لے جاتے ۔ اس دوران انہوں نے کرشن چندر، منٹو، قرۃ العین حیدر سمیت دیگر بہت سے ادیبوں کی کتب کا مطالعہ کیا۔ دسمبر ۱۹۸۶ء میں وہ پنجاب گورنمنٹ کے شعبۂ تعلیم (ٹیکنیکل ونگ) میں جونیر انسٹرکٹر منتخب ہوگئے اور انھیں گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی ملتان میں تعینات کیا گیا۔ یہ ملازمت ان کے مزاج سے مناسبت

رکھتی تھی۔ یہاں رہ کر انہوں نے اپنی مستقبل کی راہیں متعین کیں اور تدریس و تعلیم کو ہی اپنے مستقل رزق کے وسیلے کے طور پر چن لیا۔ اس کے لئے وہ یہاں تدریس کے دوران اپنی تعلیمی استعداد کو بڑھانے کیلئے بھی کوشاں رہے۔ انہوں نے باقاعدہ طالبعلم کے طور پر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبہ اردو میں داخلہ لے لیا اور شام کی شفٹ میں گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی ملتان میں تدریس بھی جاری رکھی۔(۱۴) یونیورسٹی میں وہ اپنے جن اساتذہ سے بے حد متاثر ہوئے ان میں ڈاکٹر انوار احمد اورڈاکٹرنجیب جمال کے نام اہم ہیں۔ یہاں اسد نے طلبہ کے ایک جریدے ''فکر نو'' کا فیض نمبر ترتیب دیا۔ ۱۹۸۹ء میں وہ ایم اے اردو کرنے کے بعد یونیورسٹی گیلانی لا کالج ملتان میں‌ایل ایل بی سال اول میں‌داخلہ لے کر دوبارہ طالبعلم بن گئے۔ بار بار طالبعلم بن جانے کا ایسا سودا اُن کے سر میں سمایا کہ اعلیٰ تعلیم کا خواب پورا ہوتا نظر آیا۔ ایل ایل بی میں کامیابی کے بعد انہوں نے ۱۹۹۱ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں ایم فل اقبالیات میں داخلہ لے لیا اور ''ملتان میں اقبال شناسی'' کے عنوان سے ڈاکٹر نجیب جمال کی نگرانی میں یہ مقالہ انہوں نے بے حد محنت سے تحریر کیا۔اس دوران تحقیق کا صحیح ذوق اور اس سے ان کی دلچسپی بڑھی۔انہوں نے اس مقالے کی تیاری کے لئے ملک بھر میں لائبریریوں کے چکر لگائے اور کتابوں کو کھنگالا۔۱۹۹۵ میں انھیں علامہ اقبا ل اوپن یونیورسٹی نے ایم فل کی ڈگری دی۔ ۱۹۹۹میں یہ تحقیقی مقالہ نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آبادنے شائع کیا۔ اسی برس اسد فیض پنجاب پبلک سروس کیمشن سے اردو کے لیکچرر منتخب ہوگئے(۱۵) اور ان کی پہلی تعیناتی ''گورنمنٹ انٹر کالج دنیا پور'' میں ہوئی۔ یہ ملتان سے چالیس میل د ور بہاولپور کی طرف جانے والے راستے پر واقع ایک قصباتی شہر ہے۔ اسد فیض اس کالج میں دسمبر ۱۹۹۵ء سے ۲۰۰۲ء تک تعینات رہے۔اس دوران انھیں دبئی میں ملازمت کی ایک پیشکش اور ویزا بھی موصول ہوا لیکن وہ تعلیم و تدریس کے ساتھ استقامت سے جڑے رہے۔ یہاں کالج آنے کے لئے انھیں تین گھنٹے روزانہ بس کا سفر کرنا پڑتا تھا۔یہ سفر کتابوں کے مطالعہ میں گزرتا تھا۔ یہاں اسد نے طلبا کے ساتھ کرکٹ کھیلی،غریب طلبا کو مفت کتب کی فراہمی کے لئے بک کلب بنایا۔ یہ چھ برس انھوں نے بے حد آسودگی سے بسر کئے۔ اس دوران انہوں نے اپنے والد کے نام سے ایک اخبار کا ڈیکلریشن پنجاب گورنمنٹ سے حاصل کیا اور ''ہفت روزہ ملتان ما'' کی اشاعت کا تجربہ کیا۔کچھ شماروں کی اشاعت کے بعد ہی انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ ایک مشکل کام ہے۔ اس کے بعد ''ہم عصر'' کے نام سے ایک ادبی جریدہ کی اشاعت کا ارادہ کیا۔ہم عصر کا پہلا شمارہ ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ یہ ۸۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کا پہلا شمارہ احمد ندیم قاسمی صاحب کو بھیجا گیا تو انھوں نے اسد کو جوابی خط میں لکھا۔

''ہم عصر کا شمارہ ملا۔ممنون ہوں ،ملتان یقیناً علم وفن اورفکر و دانش کا صدیوں پرانا گڑھ ہے۔ وہاں سے ایک تحقیقی اور تنقیدی رسالہ نکالنا ضروری تھا۔ یہ ذرا مشکل کام ہے مگر مجھے امید ہے کہ آپ استقامت سے کام لیں گے۔(۱۶)

اسدفیض مئی ۲۰۰۲ء میں اپنی درخواست پر گورنمنٹ گورڈن کالج راولپنڈی ٹرانسفر کردیئے گئے۔ اس کا سبب یہ بنا کہ دنیا پور کے مسلسل سفر نے ان کی ریڑھ کی ہڈی کو متاثر کیا تھا۔ موسم گرما کی ایک صبح جب کالج سے موسم گرما کی تعطیلات تھیں وہ زمین پر گر گئے اور دوبارہ نہ اٹھ سکے۔ فورا ہسپتال پہنچایا گیا جہاں نیورو سرجن نے ریڑھ کی ہڈی کا آپریشن کیا اور انھیں مشورہ دیا کہ وہ آرام کریں اور دنیا پور سے تبادلہ کرالیں۔ اس طرح وہ ڈاکٹر کی ہدایت پر راولپنڈی پہنچ گئے۔ گورڈن کالج اور نئے شہر میں اسدفیض نے بہت جلد اپنے آپ کو نئے ما حول میں ڈھال لیا تھا۔ گورڈن کالج کے تعلیمی ماحول اور لائبریری نے انھیں بے حدمتاثر کیا۔ ''ہم عصر'' کی اشاعت تو دوبارہ ممکن نہ ہوسکی لیکن اسدفیض نے پی ایچ ڈی کے مقالہ کی تیاری میں تیزی سے پیش رفت کی اور دو برس بعد ہی ۲۰۰۴ء کی ابتدا میں تحقیقی مقالہ مکمل کرکے یونیورسٹی میں جمع کرادیا۔ ۲۰۰۵ء جنوری میں اسد فیض کو مقالہ پر مثبت رپورٹوں کے بعد زبانی امتحان اور دفاع کے لئے بلوایا گیا۔ مقالہ کے تین ممتحن ڈاکٹر خلیق انجم، دہلی؛ ابولکلام قاسمی؛ علی گڑھ اور ڈاکٹر جمیل جالبی تھے۔دفاع اور زبانی امتحان کی تکمیل کے لئے ڈاکٹر جمیل جالبی کراچی سے تشریف لائے تھے اور یوں اسد فیض؛ ڈاکٹر اسد فیض ہوگئے۔قسمت نے یاوری کی اور اسی برس پی ایچ ڈی کے حصول کے فوراً بعد وہ فیڈرل پبلک سروس کمیشن سے وفاقی حکومت کے ماڈل کالجز میں اسٹنٹ پروفیسر اردومنتخب ہوگئے۔ ان کو اسلام آباد ماڈل کالج فار بوائز، جی الیون ون میں تعینات کیا گیا۔ اکتوبر ۲۰۱۰ء میں انھیں وفاقی حکومت نے ۱۹ ویں گریڈ میں بہ حیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر ترقی دے دی۔ اسلام آباد میں اسد فیض کو بیماریوں نے بھی مضمحل کئے رکھا لیکن علم و ادب سے ان کی بے لوث محبت بھی جاری رہی۔ اسلام آباد میں آمد کے بعد ان کی مزید کتب بھی چھپیں، اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے امتحانات کے پرچہ ساز، ممتحن، اور انٹرویور بھی رہے۔ جامعات میں پرچہ ساز اور ممتحن بننے کے مواقع بھی ملے۔ یوں سفرحیات جاری ہے۔

خانگی زندگی:

اسد فیض کی شادی ۲۱نومبر ۱۹۹۱ء کو کراچی میں ان کے ماموں حبیب احمد جاوید کی بیٹی روبینہ حبیب (پ۔۱۹۶۳ء) سے انجام پائی(۱۷)۔ روبینہ حبیب اپنی تین بہنوں میں دوسرے نمبر پر ہیں۔ انہوں نے۱۹۹۰ء میں جامعۂ کراچی سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا۔ اسد فیض کے چار بچے ہیں، تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ جن میں بڑی بیٹی سارہ اسد جو۱۹۹۲ء میں کراچی میں پیدا ہوئیں۔ وہ ایم اے اردو کی طالبہ ہیں۔ دوسرے نمبر پرسلمان اسد ہیں وہ ۱۹۹۵ء میں کراچی میں پیدا ہوئے اور یونیورسٹی آف لاہور، اسلام آباد کیمپس میں بیچلر ان کمپیوٹر سائنس چھٹے سمسٹر کے طالب علم ہیں۔ تیسرے نمبر پر عدین اسد ہیں۔ یہ ۱۹۹۹ء میں ملتان میں پیدا ہوئے۔ اسلام آباد کے ایک کالج میں ایف ایس سی کے طالب علم ہیں۔ چوتھے نمبر پر راویل احمد ہیں یہ ۲۰۰۴ء میں راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ بیکن ہاؤس میں ساتویں جماعت کے طالب علم ہیں۔ اسد فیض کو اپنی بڑی بیٹی سے بے حد محبت اور لگاؤ ہے ان کی خواہش ہے کہ وہ ادب میں نام پیدا کرے۔ بچوں میں راویل احمد کبھی کبھی شاعری میں طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔

اسد فیض کے گھر کا ماحول مذہبی ہے۔ اسد فیض کسی سلسلہ میں بیعت نہیں ہیں۔ لیکن مختلف بزرگان دین سے ان کی ملاقاتیں رہی ہیں۔ ان میں خواجہ شمس الدین عظیمی کراچی (ان کے جریدے روحانی ڈائجسٹ کراچی کے لئے اسد فیض بچوں کا صفحہ بھی ترتیب دیتے رہے ہیں ۔ جس میں وہ ایک اسلامی انسائکلو پیڈیا بھی ترتیب دیتے تھے) کے کہنے پر اسد فیض نے ملتان اورساہیوال میں کچھ بزرگان دین سے روح کے موضوع پر مکالمے بھی تحریر کئے۔ اسد فیض سید سرفراز شاہ صاحب کی محافل میں بھی شرکت کرتے رہے ہیں۔ ممتاز مفتی نے انھیں گوجر خان میں پروفیسر احمد رفیق اختر کے پاس جانے کا بھی مشورہ دیا تھا۔(۱۸) اسد فیض پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں آف حیدر آباد سے بھی متاثر رہے ہیں، اس کے علاوہ مختلف سلاسل کی تصوف پر کتابیں بھی ان کے زیر مطالعہ رہتی ہیں جو اب ان کی لائبریری کا حصہ ہیں۔

شخصیت و کردار:

اسد فیض ۲۲ اپریل کو پیدا ہوئے۔ اس اعتبار سے ان کا برج ثور اور ستارہ زھرہ ہے علم نجوم کے

مطابق برج ثور سے تعلق رکھنے والے لوگ فنکارانہ ذہن کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ ہر چیز کو مکمل صورت میں دیکھنے کے بھی عادی ہوتے ہیں اور جفاکش لوگ ہوتے ہیں۔ اسد فیض کی زندگی کئی اعتبار سے اس کے مطابق بسر ہوتی رہی ہے۔ اُن کے والد بتاتے ہیں کہ:

''وہ بچپن میں شرارتی بھی تھے لیکن ان کی شرارتیں کسی کو تنگ کرنے یا نقصان پہنچانے کے لئے نہیں ہوتی تھیں اور ان کی کبھی کسی نے شکایت بھی نہیں کی''(۱۹)

اسد فیض کے چھوٹے بھائی آصف فیض ان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''وہ بے حد نرم دل انسان ہیں اور کسی کو مصیبت میں نہیں دیکھ سکتے۔ اُن کی زندگی مسلسل تگ و دو کی کہانی ہے۔ ان کو اپنے والدین سے بے حد محبت رہی ہے۔ اور وہ ان کا بے حد ادب اور احترام بھی کرتے ہیں۔ آخری بار والدہ ان کے ساتھ ۲۰۱۳ء میں عمرہ کے لئے سعودی عرب گئیں تھیں اور واپسی پر اچانک ہی اسلام آباد میں وفات پا گئیں۔ وہ آج بھی ان کو بے حد یاد کرتے ہیں۔''(۲۰)

ڈاکٹر طاہر تونسوی ڈاکٹر اسد فیض کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اسد فیض قرطاس و قلم کی نئی نسل کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جن کی ہمہ جہت تحریروں میں شانت ندی کا سا بہاؤ اور سنگلاخ چٹانوں سے نکل کر میدانوں میں بہنے والے دریاؤں کی وسعت ٹھہراؤ اور پھیلاؤ ہے اس کے ساتھ ایک ایسا اعتدال و توازن بھی ہے۔ جو ان کے دھیمے مزاج سے نہ صرف ہم آہنگ ہے بلکہ دیرپا اثرات کا حامل ہے۔''(۲۱)

اسد فیض کا کہنا ہے کہ اُن کا دھیما لہجہ دراصل ان کی والدہ کی شخصیت کا آئینہ دار ہے جن کے ان کے مزاج اور شخصیت پر بے حد اثرات ہیں(۲۲) ممتاز مفتی نے اپنے سفرنامہ ''ہند یاترا'' میں لکھا ہے۔

''مجھے دوابے والوں سے بڑا لگاؤ تھا اُن میں ایک مٹھاس تھی ایک رواداری تھی ان کے لباس بڑے سادہ ہوتے انداز میں تفاخر نہ ہوتا ان کی میں اخروٹ کے چھلکے کی طرح سخت نہ تھی بلکہ آلو کے چھلکے جیسی نرم نرم تھی۔ اُن میں ٹین نہ تھی نمائش نہ تھی دکھاوا نہ تھا میرا جی چاہتا تھا کہ میں جالندھر دیکھوں اور کچھ نہیں تو ریل کا اسٹیشن ہی سہی مجھے جالندھر کا گڑ بہت پسند تھا اور پھر وہاں کے لوگ ان کی بولی میں رویئے میں اسی گڑ کی چاشنی تھی۔ جالندھر دوابے کا دل تھا وہی سادگی، وہی بے تکلفی وہی خلوص وہی قربت پتہ نہیں یہ علاقے کے پانی کا اثر تھا یا ہوا کا۔''(۲۳)

ڈاکٹر اسد فیض اپنی صحافتی اور ادبی زندگی میں جن ادیبوں سے بھی ملے ان میں سے اکثر کے ساتھ ان کا تعلق خاطر ان ادیبوں کی آخری عمر تک قائم رہا۔ ڈاکٹر خلیق انجم (۱۹۳۵۔۲۰۱۶ء) دہلی سے اسد فیض کی ملاقات اسلام آباد میں ہوئی۔دہلی جا کر انہوں نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا:

''آپ کا خط موصول ہوا۔وہ دن یاد آگئے جو میں نے آپ کے ساتھ اسلام آباد میں گزارے تھے۔بہت کم وقت کے لئے ملے لیکن آپ کی شخصیت نے مجھے بہت متاثر کیا۔ آپ کو جب بھی ہندوستان سے کسی کتاب کی ضرورت ہو تو بے تکلف لکھ دیا کیجئے آپ کا بڑا بھائی دہلی میں بیٹھا ہوا ہے''(۲۴)

اسد فیض کے ایک کلاس فیلو ڈاکٹر جاوید اصغر اسد فیض پر اپنے خاکہ'' مانوس اجنبی''میں لکھتے ہیں:

''کلاس میں پہلے روز حسب روایت تعارفی مہم جاری تھی لیڈیز فرسٹ کے کالے قانون کے تحت ہماری کلاس کی خواتین اپنی عمر کے سوا اپنے مختصر کارہائے نمایاں بتا کر جب فارغ ہوئیں تو لڑکوں نے اپنے آبا و اجداد کی تفصیل مع کارناموں کے وہ سب کچھ بتا ڈالا۔جو ایسی مخلوط محفلوں میں نہیں بتانا چاہئیے تھا۔اسی تعارفی تقریب میں پچھلی نشستوں سے ایک بزرگ آواز نے مجھے چونکا دیا ۔پر اعتماد لہجہ،محتاط انداز،سنجیدہ پیرایہ گفتگو اس عمر میں اس بزرگ نے جو کارنامے اور مصروفیتیں گنوائیں۔ وہ پہلی عمر کے لڑکے بالوں کا شغل ہی نہ تھا۔ مجھے تو صرف نام اسد فیض یاد رہ گیا۔''(۲۵)

ممتاز مفتی اور ڈاکٹر وزیر آغا سے ایک ایک ملاقات کے بعد ان کی نیاز مندی دونوں کے انتقال تک قائم دائم رہی اس دوران ان کے مابین جو خط و کتابت ہوتی رہی وہ چھپ چکی ہے۔ اسد فیض کا کہنا ہے کہ ان کا نظریہ حیات ہے کہ زندگی اللہ تعالی کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کی قدر کرنی چاہیئے۔ ان کی رائے میں زندگی کا مقصد دوسروں کے کام آنا ہے اور کوئی ایسا کام بھی سرانجام دینا ہے جو رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے۔ اس کے علاوہ انسان کی اصل زندگی دینی زندگی ہے۔

ادبی وصحافتی زندگی:

اسد فیض کی بچوں کے لئے پہلی کہانی'' ہم نے چڑیا پکڑی''ان کے ایک دوست محمد اختر کے توسط سے بچوں کے ایک اخبار''بچوں کی دنیا'' کوئٹہ میں۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔(۲۶) اس وقت ان کی عمر دس سال تھی۔ اس کے بعد وہ مسلسل کہانیاں لکھتے رہے''نوائے وقت'' اخباراُن کے گھر روزانہ آتا تھا۔اس میں بچوں کے صفحہ میں یہ کہانیاں چھپتی رہیں اوراسد فیض کے گھر والوں کی طرف سے مسلسل ان کی حوصلہ افزائی کی

جاتی رہی۔ بچوں کے بہت سارے رسائل مثلا ''تعلیم و تربیت''،''نونہال'' ''،ہونہار'' ان کے مطالعہ میں رہتے تھے اور وہ ان کو محفوظ بھی رکھتے تھے۔ اسد فیض جب اپنے سکول میں آٹھویں جماعت کے طالبعلم تھے تو اپنے ہاتھ سے لکھ کر ایک جریدہ ''مضمونات'' بھی مرتب کرتے تھے جسے ان کے کلاس فیلو باری باری پڑھتے تھے۔(۲۷) اسد فیض نے بچوں کی کہانیوں سے جس سفر کا آغاز کیا وہ کئی ابعاد میں جاری و ساری رہا۔ سمہ سٹہ میں قیام کے دوران ماحول کے زیر اثر وہ صحافت کی طرف مائل ہوئے۔ سمہ سٹہ میں ریلوے کا ایک کلب تھا جہاں وہ خود بھی کرکٹ کھیلنے جاتے تھے۔کھیل میں وہ کوئی نمایاں کارکردگی نہ دکھا سکے لیکن چونکہ لکھنے پڑھنے کے دھنی تھے اور شوق رکھتے تھے۔ اس لئے قلم کے جوہر دکھانے لگے۔کراچی کے کھیلوں کے جریدے ماہ نامہ سپورٹس انٹرنیشنل نے انھیں ابتدا میں بہاولپور میں اپنے جریدہ کا ڈسٹرکٹ سپورٹس رپورٹر مقرر کردیا اس میں وہ ہر ماہ بہاولپور کی سپورٹس ڈائری لکھتے تھے۔(۲۸) بہاولپور میں کھیلوں کی سرگرمیاں بے حد منظّم تھیں اور ملکی سطح پر کھیلوں کے فروغ میں بہاولپور کا ایک اہم کردار تھا۔ ہاکی، فٹبال، اتھلیٹکس اور کرکٹ کے کئی قومی اور بین الاقوامی سطح کے کھلاڑیوں نے یہاں جنم لیا۔ یہاں ایک عالمی سطح کا اسٹیڈیم بھی واقع ہے۔ اسد نے بہت سے کرکٹ کے اور ہاکی کے عالمی مقابلوں کی کوریج کی۔ اس دوران لاتعداد کھلاڑیوں کے انٹرویو بھی کئے۔ ان میں قومی ہاکی ٹیم کے تین کپتانوں سمیع اللہ اور کلیم اللہ،حسن سردار کے علاوہ کرکٹ کے مدثر نذر، انیل دلپت، راشد خاں، تسلیم عارف کے نام بھی شامل ہیں۔ اس دوران اسد فیض کے مضامین روزنامہ امروز لاہور اور روزنامہ جنگ کے کھیلوں کے صفحہ پر بھی شائع ہوتے رہے۔ اسد فیض بعد ازاں ماہنامہ کھیل لاہور، ماہ نامہ سپورٹس آبزرور کراچی کے نامہ نگار کے طور پر بھی کام کرتے رہے اور کھیلوں پر مضامین لکھتے رہے۔ نوے کی دہائی میں اسد فیض نے ریڈیو پاکستان ملتان سے ایک لائیو کھیلوں کا پروگرام ''کھیل ہمارے'' بھی پیش کیا۔ نوے کی دہائی ہی میں ملتان کے ایک کہنہ مشق صحافی اختر عزیز نے ملتان سے ''جلترنگ'' کے نام سے ایک علمی و ثقافتی جریدے کا اجرا کیا۔ اسد فیض بطور جوائنٹ ایڈیٹر اس جریدے سے وابستہ ہوگئے۔(۲۹) یہاں انہوں نے بچوں کے لئے جدوجہد آزادی کشمیر کے پس منظر میں ایک ناول ''جیل سے فرار'' بھی تحریر کیا جو بائیس اقساط میں اس جریدہ میں ایک سال دس ماہ مسلسل شائع ہوتا رہا(۳۰)۔ اسد فیض نے اداریئے لکھے، ادیبوں، سیاست دانوں کے انٹرویو کئے، کالم نگاری کی اور فیچر بھی لکھے۔ اس دوران وہ اپنی تعلیم سے غافل نہیں ہوئے۔ ایم اے اردو کے بعد انہوں نے ایم فل کیا تو انھیں تحقیق کے مضمون سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ یہ شوق انھیں پی ایچ ڈی کے خار زار میں کھینچ لے گیا۔ اس دوران ان کے مضامین پاکستان کے علاوہ انڈیا کے جرائد

میں بھی چھپنے لگے۔(۳۱) ملتان میں قیام کے دوران ہی انہوں نے ادبی جریدہ ہم عصر کا اجراء کیا۔(۳۲) اس کے پس پشت ان کا تحقیق کا شوق کارفرما رہا۔اس کے بعض شمارے انہوں نے کتابی صورت میں شائع کیے اور انڈیا پاکستان میں بے حد پسند کئے گئے۔ مثلاً ''ہم عصر'' کے جامعاتی تحقیق نمبر کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا:

''مجھے باقی شہروں کا علم نہیں لیکن لاہور میں تو آپ کا جامعاتی تحقیق نمبر ہٹ ہوگیا۔ میں ان دنوں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی میں ایم فل اردو کی کلاس کو جامعات میں تحقیق کا موضوع پڑھا رہا ہوں چنانچہ ساری کلاس نے یہ شمارہ فوٹو سٹیٹ کراکر اپنے پاس محفوظ کر رکھا ہے۔''(۳۳)

اسد فیض نے بعض تعلیمی اداروں میں بھی علمی ادبی جرائد مرتب کئے۔ان میں گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی ملتان کا جریدہ ''صناع'' اور اسلام آباد ماڈل کالج فار بوائز سیکٹر ایف ٹین تھری کا جریدہ ''وژن'' بھی شامل ہیں۔ہم عصر کی اشاعت کے دوران اسد فیض کی مختلف ادیبوں سے خط و کتابت بھی رہی ان میں سے ممتاز مفتی ،احمد ندیم قاسمی ،وزیر آغا،ڈاکٹر خلیق انجم کے خطوط چھپ چکے ہیں ۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بنام ڈاکٹر اسد فیض کے عنوان سے پشاور یونیورسٹی کی ایک طالبہ نے اسد فیض کے خطوط مرتب کئے ہیں جو شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی کے جریدہ خیابان میں طبع ہوئے ہیں۔(۳۴)

راولپنڈی تبادلہ ہونے کے بعد اسد فیض نے پی ایچ ڈی مکمل کی۔اب وہ لکھنے پڑھنے اور اپنے تحقیقی شوق کی تکمیل کے لئے آزاد تھے۔ اس دوران اکادمی ادبیات اور مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کی لائبریریوں سے انہوں نے بھرپور استفادہ کیا اور کتابوں کا سالانہ جائزہ بھی مرتب کرنے لگے۔۲۰۰۳ء کا ان کا مرتب کیا ہوا ادبی رسائل اور کتب کا جائزہ '' خدا بخش لائبریری جرنل'' پٹنہ انڈیا میں شائع ہوا ہے۔جائزہ نگاری کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر اسد فیض کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''جائزہ نگاری کی وادی پُر خار میں قدم رکھنا مبارک! آپ کو خرقہ شاگردی نہیں بلکہ خرقہ خلافت تفویض ہوا۔یہ رد بلا کے لئے تعویز کے

برعکس طاہر تونسوی ہی کافی ہے''

ایک اور خط میں جائزہ نگاری کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جائزہ کو کتابیات نہ بنایا جائے اس طرح اخبار میں چھپنے کے باوجود بھی
اسے صحافیانہ اسلوب میں نہ لکھا جائے بلکہ اسلوب بھی تنقیدی ہو اور رائے
بھی تنقید پر استوار ہونی چاہیے۔(۳۵)

لاہور سے شائع ہونے والے جریدہ '' سپوتنک'' کے کچھ شمارے بھی انہوں نے مختلف ادیبوں کے بارے میں مرتب کئے۔ان شماروں کی تحقیقی اہمیت یہ ہے کہ ان ادیبوں کے سوانحی اور ادبی کام کے اشاریئے بھی مرتب کئے گئے ہیں۔

اسد فیض کو ادبی جرائد کی اشاریہ سازی سے بھی دلچسپی رہی انہوں نے کراچی کے ادبی جریدہ ''بادبان'' سہ ماہی کا اشاریہ تیار کیا جو اخبار اردو اسلام آباد میں شائع ہوا (۳۶) جبکہ فنون کا اشاریہ بھی مرتب کیا ہے جو ہنوز زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکا۔ اسد فیض کے تحقیقی مضامین زیادہ تر قدیم دفینوں سے متعلق ہیں۔ جس میں انہوں نے مختلف ادیبوں کی غیر مدون گمشدہ تخلیقات کو دریافت کیا ہے۔ اس میں مجید امجد، اسد ملتانی، ن۔م۔راشد اور احمد ندیم قاسمی کے شعری اثاثوں میں اضافہ کیا ہے۔ اُن کا موقف ہے کہ اس طرح ان ادیبوں کی ادبی زندگی اور فنی ارتقا کو کلی طور پر جانچا جا سکتا ہے۔ ۲۰۱۵ء میں ان کی شائع ہونے والی کتاب ''منٹو کی گمشدہ تحریریں'' میں منٹو کی تخلیقات کو قدیم رسائل سے تلاش کرکے قارئین کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ ان کی آنے والی کتابوں میں رشید حسن خاں کے غیر مدون مضامین، احمد ندیم قاسمی کے ابتدائی افسانے، تحقیق پر مضامین اور منٹو کے خطوط کا کلیات،شامل ہیں۔ ۲۰۰۸ء میں اسد فیض نے نیشنل کالج آف آرٹس راولپنڈ ی کیمپس میں ڈرامہ رائٹنگ میں داخلہ لے لیا۔ اس میں شرکت کے دوران ایک فیسٹیول میں اسد فیض نے ایک مختصر ڈرامہ ''آخری توسیع'' لکھا جسے معروف ہدایت کار اور پی ٹی وی کے سابق جنرل منیجر شاہد محمود ندیم نے ڈائریکٹ کیا یہ ڈرامہ اسلام آباد کلب میں کھیلا گیا۔ اسد فیض نے بطور اداکار بھی اس ڈرامہ میں حصہ لیا۔(۳۷)

اسد فیض کے نزدیک تحقیق؛ زبان و ادب کے لئے ضروری اور بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ مشکل فن ہے۔ اس لئے بے حد کم لوگ اس طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ان کی رائے میں ایک اچھے تحقیقی مضمون کی تکمیل سے کسی صنف میں تخلیقی کام کرنے کے برابر خوشی ہوتی ہے۔(۳۸) حافظ محمود شیرانی، رشید حسن خاں، اور مشفق خواجہ اُن کے پسندیدہ محققین ہیں بعد کے محققین میں ان کی رائے میں ڈاکٹر وحید قریشی، اکرام چغتائی، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے بھی تحقیق کے میدان میں قابل قدر کام کیا ہے(۳۹)۔ اسد فیض کی رائے ہے کہ تحقیق کے کام کی رفتار میں اضافہ کے لیے ادبی رسائل کے اشاریئے مرتب کیے جانے چاہئیے تا کہ محققین کو اپنے موضوع سے متعلق مواد کی تلاش میں دقت نہ ہو۔ اس کے علاوہ ملک کے ہر شہر میں لائبریریوں کا قیام عمل میں لایا جانا چاہئیے تا کہ ملک میں مطالعہ کی عادت کو رواج دیا جائے۔(۴۰)

ڈاکٹر اسد فیض کی ا دبی وصحافتی کاوشوں کو دیکھا جائے تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی علمی اور ادبی زندگی پر ملتان کے ادبی ماحول اور ان کے اساتذہ کے اثرات بے حد گہرے ہیں۔ اسد فیض کی رائے ہے کہ ادب لکھنا اور پڑھنا زندگی کی معنویت کو جاننے اور کھوجنے کے مترادف ہے۔ اس کے علاوہ ادب اورادیب کو کسی نظریئے کے سہارے آگے نہیں بڑھنا چاہئے اور نہ کسی سیاسی تنظیم کا آلہ کار بننا چاہئے۔اسد فیض کے نظریۂ حیات کو بلاشبہ علامہ اقبال کے اس فارسی شعر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے:

''کسب کمال کُن کہ عزیز جہاں شویٰ''

تصانیف و تالیفات:

۱۔ ممتاز مفتی۔ایک مطالعہ

بہاالدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں طلبا کا جریدہ ''فکر نو'' ترتیب دینے کے بعد اسد فیض نے فکر نو کا ممتاز مفتی نمبر ترتیب دینے کا ارادہ کیا لیکن یہ چند وجوہ سے ممکن نہ ہوسکا۔ اس شمارے کے لئے اسد فیض نے اسلام آباد جا کر ممتاز مفتی کا انٹر ویو بھی ریکارڈ کیا۔ اس کتاب کے مضامین ممتاز مفتی نے خود منتخب کر کے دیئے تھے۔ کتاب کے آخر میں اسد فیض کے نام ممتاز مفتی کے خطوط بھی شامل کیے گئے ہیں۔ کتاب کی ضخامت ۹۴صفحات ہے۔ یہ کتاب سپوتنک لاہور کے ایک شمارے کی صورت میں جنوری ۲۰۰۵ میں دوبارہ شائع

ہوئی۔ اس میں دو نئے مضامین کا اضافہ بھی کیا گیا تھا۔ پس نوشت کے عنوان سے اسد فیض نے ممتاز مفتی کے ادبی کام کا اشاریہ بھی مرتب کیا۔

۲۔ دید بان

یہ اسد فیض کی دوسری کتاب ہے یہ ۱۹۹۹ء میں ملتان سے شائع ہوئی۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں ادیبوں کے انٹرویو ہیں جن میں مشہور ناموں میں ممتاز مفتی، سید قاسم محمود، امراؤ طارق، شہزاد منظر، رفق چوہدری، ادیب سہیل کے انٹر ویو شامل ہیں۔ باقی انٹرویو ملتان کے ادیبوں اور شعرا کے ہیں۔ حصہ دوم میں اسد فیض کے تنقیدی و تحقیقی مضامین شامل ہیں۔ اسد فیض کے یہ انٹرویو اور مضامین ماہ نو لاہور، ماہ نامہ جلترنگ ملتان، اور ہم عصر ملتان اور خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ میں چھپ چکے ہیں۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے جاوید اصغر نے اردو بک ریویو دہلی میں لکھا ہے:

> ''اسد فیض کی کتاب 'دیدبان' جہاں ادب کے قارئین کی دلچسپی کا سامان لئے ہوئے ہے وہاں ادب کی تحقیقی دنیا میں اہم مقام کی حامل ہے۔ اس کا انداز بیاں سلیس سادہ، دلسپ اور مدلل ہے۔''(۴۱)

اسد فیض نے اس کے بعد بھی بہت سے ادیبوں کے انٹرویو کئے ہیں جو اس کتاب کے دوسرے حصہ کے طور پر اشاعت کے منتظر ہیں۔ ان ادیبوں میں شمس الرحمٰن فاروقی، شموئل احمد، منشا یاد، مسعود مفتی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر رشید امجد اور ڈاکٹر خلیق انجم کے نام شامل ہیں۔

۳۔ ملتان میں اقبال شناسی

یہ اسد فیض کا ایم فل کا تحقیقی مقالہ ہے۔ اس کے مضامین خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ شمارہ ۱۱۱، ماہ نو لاہور اور قومی زبان کراچی شمارہ۴ جلد ۶۹ اپریل ۱۹۹۷ء میں چھپ چکے ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۹۹ء میں نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد نے شائع کی۔ کتاب کی ضخامت ۲۴۵ صفحات ہے اور یہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس

میں تحقیقی اعتبار سے ملتان میں اقبالیات کے سلسلے میں کئے جانے والے کام کا احاطہ کیا گیا ہے اور ہر ممکن طریقے سے تمام وسائل استعمال کرتے ہوئے ملتان کے ادبی منظر نامہ میں اقبالیات کے فروغ و ارتقا کا مبسوط جائزہ لیا گیا ہے۔ ادیب سہیل اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ماہ نامہ قومی زبان کراچی میں رقم طراز ہیں:

''اسد فیض صاحب کی یہ کتاب ملتان کے حوالے اورمطالعے کی چیز ہوگئی ہے اس طرح اس کے مندرجات میں تازہ ہوا کی گنجائش بھی پیدا ہوگئی ہے۔''(۴۲)

۴۔ اردو تحقیق: مسائل و رفتار

اسد فیض کی یہ کتاب ہم عصر پبلی کیشنز ملتان سے ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ہم عصر کے خصوصی شمارے جا معاتی تحقیق نمبر پر مشتمل ہے۔ اس میں چند اساتذہ کے تحقیق اور پاکستانی تحقیق کی صورت حال پر مضامین شائع کئے گئے ہیں کتاب کا اہم حصہ پاکستانی اور ہندوستانی جامعات میں اردو میں ایم فل، پی ایچ ڈی کے موضوعات کی فہارس بھی شامل اشاعت کی گئی ہیں۔ اسد فیض نے اس کا انتساب اپنے والد اور بیٹے عدین اسد کے نام کیا ہے۔ اس کے کل صفحات ۱۱۲ ہیں۔ قرطبہ یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خاں کے شعبہ لسانیات کے زیر اہتمام پی ایچ ڈی کے غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ ''اردو فن تحقیق پر مطبوعہ مواد کا تحقیقی و توضیحی جائزہ'' ۲۰۰۹ء میں مقالہ نگار مطہر شاہ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اردو زبان و ادب کے بے شمار گوشے ابھی تحقیق طلب ہیں۔ ایسے میں ایک ہی موضوع پر ایک سے زیادہ محققین کی صلاحیتیں ضائع کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ اس صورت حال میں تکرار سے بچنے اور تحقیقی رفتار کا اندازہ لگانے کے لیے جزوی فہرستوں کی ترتیب کی کوششیں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں لیکن یہ کوششیں اس سلسلے میں کافی نہیں۔ اب تک اس سلسلے میں جو مختصر سرمایہ موجود ہے اس میں اسد فیض کی کتاب'' اردو

تحقیق: مسائل و رفتار‘‘ کو ایک معتبر کوشش قرار دیا جا سکتا ہے۔‘‘(۴۳)

۵۔ اعتبار حرف

اسد فیض کی یہ کتاب ڈاکٹر طاہر تونسوی کے تحریر کردہ مضامین کے انتخاب پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر اسد فیض مقدمہ میں لکھتے ہیں:

’’ڈاکٹر طاہر تونسوی معاصر ادب کے لمحہ موجود میں ایک اہم اور منفرد ادبی شخصیت ہیں ان کا کام کئی جہتوں پر محیط ہے وہ صرف ایک ادیب ہی نہیں دانشور، نقاد، محقق اور شاعر بھی ہیں۔ اپنے عہد کے علمی و ادبی حالات، تصورات اور تغیرات پر ان کی گہری نظر ہے وہ اردو ادب کی تاریخ اور روایت کا واضح احساس اور شعور بھی رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ میں ان کے چند اہم تنقیدی مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے یہ ملک کے موقر ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں اور ہمارے ادب کی ان جہتوں کو نمایاں کرتے ہیں جو انسان دوستی زندگی کی تعبیر و تفہیم اور روشن خیالی سے عبارت ہیں۔‘‘(۴۴)

کتاب میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تنقید نگاری پر ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر قمر رئیس کے تاثرات بھی شامل ہیں جبکہ بیک کور پر گوپی چند نارنگ کی ڈاکٹر طاہر تونسوی اور ان کی تنقید کے بارے میں رائے بھی شامل اشاعت ہے۔ یہ کتاب ایشیا پبلشر فیصل آباد نے شائع کی ہے اس پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔ کتاب کی ضخامت ۲۳۰ صفحات ہے۔

۶۔ ملتان کا عصری ادب

یہ کتاب ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی کتاب کی ضخامت ۱۴۴ صفحات ہے۔ اس میں ملتان کے ادیبوں کی

تحریریں، ملتان میں ادب کی مختلف اصناف پر تحریروں، اس دور کے نمائندہ شعرا کے کلام اور اہم ادیبوں کے مکالمات اس کتاب کی ترتیب میں شامل ہیں۔ ملتان ہر دور میں علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ ملتان کی ایک خاص عصر کی تحریروں اور ادبی شخصیات کی گفتگو اور ادبی معلومات کو اس کتاب کے توسط سے محفوظ کردیا گیا ہے۔

۷۔ پاکستان میں اردو ادب کی صورت حال

ڈاکٹر اسد فیض نے معروف نقاد شہزاد منظر کی مختلف اصناف کے قیام پاکستان کے بعد آغاز و ارتقا پر لکھے گئے مضامین کو مدون کیا ہے۔ یہ مضامین پاکستان اور انڈیا کے ادبی جرائد میں طبع ہوئے ہیں۔ ان کی ادبی اور تنقیدی لحاظ سے بے حد اہمیت ہے۔ اسد فیض نے مقدمہ میں شہزاد منظر کی ادبی شخصیت اور ان مضامین کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ”شہزاد منظر ہماری ادبی دانش کا ایک اہم ستون تھے۔ بیسوی صدی کے ربع آخر میں ان کی انتقادی کاوشوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ فکشن ان کی ادبی زندگی کا بنیادی عشق تھا۔“(۴۵)

یہ کتاب فروری ۲۰۱۴ء میں پورب اکیڈمی، اسلام آباد نے شائع کی۔ اس کی ضخامت ۲۰۸ صفحات ہے۔

اس کتاب میں شہزاد منظر کے درج ذیل مضامین شامل ہیں۔ آزادی کے بعد اردو افسانہ، پاکستان میں اردو ناول، پاکستان میں اردوغزل کے پچاس سال، پاکستان میں اردو تنقید، تنقید میری نظر میں۔

۸۔ منٹو کی گمشدہ تحریریں

یہ اسد فیض کی اب تک شائع ہونے والی آخری کتاب ہے جو ۲۰۱۴ء میں کراچی سے طبع ہوئی ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ میں منٹو کی غیر مدون تحریریں ہیں یہ کل تیرہ ہیں ان میں ایک غیر مدون

افسانہ بارہ روپے اور ڈرامہ بھی ہے جبکہ بقیہ تراجم ہیں۔ دوسرے حصہ میں منٹو کی ایسی تحریریں شامل ہیں جو بعد ازاں مختلف ناموں سے چھپی ہیں۔ ان میں ایک ایسی تحریر بھی ہے جو منٹو کی اہلیہ کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اسد فیض کا دعویٰ ہے کہ یہ منٹو کی ہی تحریر ہے۔ تیسرے حصہ میں اسد فیض کے لکھے ہوئے مضامین ہیں۔ جو پاک و ہند کے مختلف ادبی جرائد میں چھپے ہیں۔ اس کتاب میں منٹو کے حوالے سے لکھی گئی چند نظمیں بھی شامل ہیں۔ معروف نقاد اور کتابی سیریز ''تناظر'' کے ایڈیٹر ایم۔ خالد فیاض اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''یہ سچ ہے کہ منٹو کی گم شدہ تحریروں پر مبنی ایک پورا نسخہ شہزاد منظر ترتیب دے گئے تھے لیکن اُس میں سے بیش تر تحریریں بقول ڈاکٹر اسد فیض، بعد میں شائع ہوگئیں اور صرف تین تحریریں ایسی بچیں جو ابھی تک مدون نہیں ہو سکی تھیں لہذا یہ تین تحریریں اس کتاب میں شامل کر کے ڈاکٹر اسد فیض نے شہزاد منظر کو شریک مرتب کیا ہے۔ جو ایمانداری اور فراغ دلی کا بین ثبوت ہے۔ بلاشبہ منٹویات کی ذیل میں یہ کتاب ایک اہم اضافہ ہے۔''(۴۶)

حمیرا اظہر روزنامہ ''جناح'' کراچی میں اپنے مضمون ''منٹو کی گم شدہ تحریریں۔ایک مطالعہ'' میں لکھتی ہیں:

> ''منٹو کی گم شدہ تحریریں'' منٹو کی رنگا رنگ تحریروں سے سجی ہے اس میں منٹو کے تحریر کردہ ترجمے، طبع زاد مضامین، خطوط، افسانے، فیچر اور ڈراما ہی نہیں خود منٹو کے بارے میں دیگر ادیب و شعرا کے مضامین اور نظمیں شامل ہیں۔ یوں منٹو شناسی کے حوالے سے یہ ایک اہم کتاب ہے جو ہر ادبی لائبریری میں ہونی ضروری ہے۔''(۴۷)

ادبی معرکہ آرائی

اردو ادب میں ابتدا ہی سے ادبی معرکوں اور گروپ بندیوں کا چرچا رہا ہے۔ کئی اعتبار سے ادب کے فروغ میں ان کا اہم کردار بھی رہا ہے۔ جن سے ادب اور ادیب اور کسی خاص دور کے ادیبوں کے مزاج اور نفسیات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسد فیض کے حوالے سے دو واقعات یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ جن میں اسد فیض کا ردِعمل ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔

اکتوبر ۲۰۰۳ء کے ماہ نامہ تخلیق لاہور میں ڈاکٹر انور سدید کا ایک خط شائع ہوا۔ جس میں ایڈیٹر تخلیق کو وہ لکھتے ہیں:

> ''آپ کا ایک اور شکریہ بھی واجب ہے کہ آپ نے مجھے جمیل یوسف کا وہ مکتوب بھی پڑھوادیا جو انہوں نے اسد فیض صاحب کے انٹر ویو سے انکار کے بارے میں آپ کو اور متعدد مدیران جرائد کو لکھا تھا اور جس میں یہ الزام لگایا گیا تھا کہ اردو ادب کی تحریکیں انور سدید نے نہیں ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھی ہے۔ جمیل یوسف صاحب کا یہ الزام غیر متوقع نہیں اور میں اس کا بھرپور جواب جو گفتنی کے علاوہ ناگفتنی پر مشتمل تھا لکھ چکا تھا لیکن اب انہوں نے اسد فیض کی جعل سازی کا پول کھول دیا ہے اور اپنی بریت خود کرلی ہے تو میں ان سے شکوہ نہیں کرتا البتہ لطیف ساحل اور جناب سیف اللہ خالد نے ایک جعلی انٹرویو چھاپ کر جس غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا ہے اس کے لئے وہ ادبی معاشرے کے سامنے جواب دہ ہیں۔'' (۴۸)

ڈاکٹر اسد فیض کا کہنا ہے کہ وہ اس خط کے مندرجات سے متفق نہیں تھے کیونکہ انہوں نے ایسا کچھ نہیں لکھا تھا۔ ڈاکٹر انور سدید نے کسی غلط فہمی کی بنا پر ایسا لکھ دیا تھا جس کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ لیکن انھیں پریشانی ضرور تھی کہ ان کا نام کیوں اس معاملے میں لیا گیا۔ ان کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ وہ بھی ایک

سخت خط ڈاکٹر انور سدید کے نام لکھ دیں لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ایک ماہ کے وقفہ کے بعد ''تخلیق'' کے دسمبر۲۰۰۳ء کے شمارہ میں خطوط کے کالم میں ڈاکٹر انور سدید کا ایک اور خط طبع ہوا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

> ''برادرم اظہر جاوید،سلام مسنون یہ عریضہ انتہائی ندامت کا باعث ''انجمن خیال'' کا وہ مکتوب ہے جو جمیل یوسف صاحب کے انٹرویو اور ان کی وضاحت کے سلسلے میں اکتوبر کے شمارے میں شائع ہوا۔تخلیق کے بعد اے جی جوش صاحب کا رسالہ ''ادب دوست'' ملا تو مجھے اپنی اس غلطی کا احساس ہوا کہ میں نے متذکرہ انٹرویو میں غلطی سے طارق اسد کی بجائے اسد فیض صاحب کا نام لکھ دیا اور انٹرویو اُن سے منسوب کردیا۔ اب غلطی کا تجزیہ کرتا ہوں تو یہ حافظے کی کمزوری کا نتیجہ نظر آیا جس کا ذکر میں ''تخلیق'' کے مکتوب میں بھی کرچکا ہوں میں ان دنوں عمر ضعیفی کے سال گزار رہا ہوں۔ قویٰ کمزور اور اعصاب مضمحل ہورہے ہیں۔ اعصاب کے اضمحلال کا نتیجہ ہی حافظے کی کمزوری بھی ہے۔ میں اسد فیض صاحب سے دست بستہ اس غلطی کی معافی مانگتا ہوں۔ مجھے اُن کا پتہ معلوم نہیں، معلوم ہوتا تو براہ راست اُن سے عفو خواہ ہوتا۔''(۴۹)

دوسرا واقعہ ان کے ایک مضمون ''مجید امجد کی چند غیر مدون نظمیں'' کی اشاعت سے متعلق ہے جو پہلی بار اگست۲۰۱۰ء میں ماہ نامہ الحمرا، لاہور میں شائع ہوا۔مضمون کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر خواجہ زکریا صاحب نے ایڈیٹر الحمرا کو لکھا کہ:

> ''میرے پاس مجید امجد کی تقریباً ڈیڑھ سو نظمیں ایسی موجود ہیں جو ۱۹۳۲ء سے ۱۹۵۵ء کے درمیان لکھی گئیں۔ ان میں سے بیشتر نظمیں مجید امجد کی اچھی نظموں کے معیار سے فروتر ہیں۔''(۵۰)

یعنی ڈاکٹر خواجہ ذکریا کا موقف تھا کہ اسد فیض نے جو نظمیں مجید امجد سے متعلق اپنے مضمون میں درج کی ہیں ایسی ڈیڑھ سو نظمیں ان کے پاس موجود ہیں جو غیر معیاری ہونے کے سبب سے انھوں نے کلیات مجید امجد میں شامل نہیں کیں۔

ڈاکٹر اسد فیض نے ایڈیٹر کی ڈاک میں اس کے جواب میں لکھا کہ:

''ڈاکٹر خواجہ ذکریا صاحب نے ایسا کر کے ادبی معاشرہ پر ظلم کیا ہے کہ مجید امجد کی اچھی نظمیں تو کلیات میں جمع کر دیں لیکن کمزور نظمیں الگ کر دیں اور ابھی تک اپنے پاس رکھی ہوئی ہیں اس طرح انھوں نے قارئین کو مجید امجد کی یک طرفہ تصویر دکھائی ہے۔ حالانکہ ان کا تمام ادبی اثاثہ چھاپ کر انھیں مجید امجد کی اصل تصویر قارئین کے سامنے پیش کرنی چاہئے تھی۔''(۵۱)

ڈاکٹر انور سدید نے ایڈیٹر کے نام اپنے خط میں لکھا:

''ڈاکٹر اسد فیض نے مجید امجد کی چند غیر مدون نظمیں تلاش کرنے کی کاوش کی ہے۔ لیکن یہ وہ کلام ہے جسے اب مجید امجد کا تاریخی کلام سمجھ کر ہی پڑھ جا سکتا ہے۔ بعض نظمیں تو ایسی ہیں جنھیں شب رفتہ میں خود مجید امجد نے شامل نہیں کیا۔ ہاں اسد فیض صاحب کی تحقیقی کاوش کی داد دی جا سکتی ہے کہ وہ گم شدہ نوادر تلاش کرنے میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔''(۵۲)

یہ مضمون انڈیا میں بھی خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ میں چھپا (۵۳) اور بعد ازاں ماہ نامہ قومی زبان کراچی میں جنوری ۲۰۱۱ء میں بھی طبع ہوا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے جمیل الدین عالی روزنامہ جنگ کراچی میں اپنے کالم میں لکھتے ہیں:

''انجمن ترقی اردو کا ماہانہ جریدہ قومی زبان جنوری ۲۰۱۱ء ایک خاص الخاص شمارہ لگتا ہے خصوصا اس میں مجید امجد مرحوم پر ڈاکٹر اسد شفیق (فیض) کا مضمون نہ صرف مجید امجد پر بلکہ پوری زندگی پر بڑا ذہن کشا ہے میں نے برسوں بعد ایسا فکر انگیز مضمون پڑھا اور بار بار پڑھ رہا ہوں کاش آپ قومی زبان حاصل کر سکیں۔ میں صاحب مضمون ڈاکٹر اسد فیض صاحب سے ذاتی طور واقف نہیں ہوں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے۔ کوئی بہت پڑھے لکھے ساتھ ساتھ بڑے سوچنے والے انسان لگتے ہیں۔ می ں چاہوں گا کہ جس حد تک ممکن ہو ان کے مضامین اور کتابیں چھپیں۔'' (۵۴)

مطبوعہ مقالات

۱۔ ملتان میں اقبال شناسی کی روایت، خدابخش لائبریری جرنل پٹنہ (انڈیا) مارچ ۱۹۹۸ء، شمارہ نمبر ۱۱۱

۲۔ کریسنٹ کا ایک یادگار شمارہ، خدا بخش لائبریری جرنل (پٹنہ) جون ۱۹۹۹ء شمارہ نمبر ۱۱۶

۳۔ مجلّہ ایسٹ اینڈ ویسٹ اور اقبال شناسی، خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ (انڈیا) ، دسمبر ۱۹۹۹ شمارہ نمبر ۱۱۸

۴۔ اردو ادب اور انٹرنیٹ، ماہنامہ اخبار اردو، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، دسمبر ۲۰۰۲ء، اردو بک ریویو (ماہ نامہ)، نئی دہلی مئی۔ جون ۲۰۰۳ء ص ۲۵۔۲۶

۵۔ ملتان میں اردو کے قدیم ادبی جرائد، خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، جنوری۔ مارچ ۲۰۰۴ء شمارہ نمبر ۱۳۵

۷۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور گورڈونین، ہفت روزہ ہماری زبان نئی دہلی، یکم تا ۷ مئی ۲۰۰۵ء

۹۔ کرشن چندر کا ایک غیر مطبوعہ خط،ہفت روزہ ہماری زبان نئی دہلی ، ۱۵ تا ۱۲ جولائی ۲۰۰۶ء

۱۰۔ رسالہ ہمایوں اور منٹو ،ماہنامہ الحمرا لاہور ،مئی ۲۰۰۷ء،ما ہ نامہ قومی زبان کراچی مئی ۲۰۰۷ء

۱۱۔ عالمگیر کا ایک خاص شمارہ ، ماہ نامہ قومی زبان کراچی ،ستمبر ۲۰۰۷ء

۱۴۔ منٹو کی دو نادر تحریریں، ماہ نامہ الحمراء لاہور، فروری ۲۰۰۹ء

۱۵۔ منٹو کی چار نادر تحریریں، اردو نامہ، سہ ماہی لاہور اپریل تا جون ۲۰۰۹ء، جلدنمبر۳،شمارہ ۲، ذہن جدید (ماہ نامہ) دہلی

۱۶۔ الکاشف کا ایک خاص شمارہ، ادب معلیٰ، لاہور سہ ماہی، اپریل تا جون ۲۰۰۹ء، جلد نمبر ۳ شمارہ نمبر ۲

۱۷۔ قطعات تاریخ وفات اقبال،پیغام آشنا،سہ ماہی اسلام آباد اپریل تا جون ۲۰۰۹ء، جلد۲۶، شمارہ نمبر ۲

۱۸۔ مجید امجد کی چند غیر مدون نظمیں،ماہ نامہ الحمراء لاہور اگست۲۰۱۰ء

۱۹۔ نودرات جوش،سہ ماہی ادبیات اسلام آباد،اپریل تا جون ۲۰۱۰ء

۲۰۔ احمد ندیم قاسمی بنام اسد فیض۔ماہ نامہ قومی زبان کراچی،جولائی ۲۰۱۰ء

۲۱۔ مولوی عبدالحق کی ایک نادر تحریر،ماہ نامہ قومی زبان کراچی ،اگست ۲۰۱۰ء

۲۲۔ مشا ہیر ادب کی نادر تحریریں، دریافت، جنوری ۲۰۱۱ء، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

۲۳۔ ملتان کا ایک نیک نام شاعر،اسد ملتانی، ماہ نامہ قومی زبان کراچی، جلد ۸۳، شمارہ ۹، ستمبر ۲۰۱۱ء

۲۴۔ اردو کے اہم ادبی جرائد کے اولین شمارے ،معارف (ماہ نامہ) اعظم گڑھ، انڈیا، اپریل ۲۰۱۲ء

۲۵۔ ایک صدی کا قصہ ،نیرنگ خیال کا اولین شمارہ، ماہ نامہ نیرنگ خیال راولپنڈی، جولائی ۲۰۱۲ء

۲۶۔ اشاریہ سہ ماہی بادبان کراچی، ماہ نامہ اخبار اردو اسلام آباد، ،جلد ۳۰، شمارہ نمبر ۹، ستمبر ۲۰۱۲ء (پہلی قسط) نومبر۲۰۱۲ (دوسری قسط)،دسمبر ۲۰۱۲ (تیسری قسط)

۲۷۔ ممتاز مفتی کے خطوط، ماہ نامہ نیرنگ خیال راولپنڈی، جولائی ۲۰۱۳ء

۲۸۔ ن م راشد کا غیر مدون کلام،ماہ نامہ قومی زبان کراچی، جنوری ۲۰۱۵ء

۲۹۔ مشاہیر کے خطوط،ماہ نامہ قومی زبان کراچی،جولائی ۲۰۱۵ء

۳۰۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی غیر مدون شاعری،ماہ نامہ قومی زبان کراچی،اگست ۲۰۱۵ء

سالانہ ادبی جائزے

۱۔ ۲۰۰۳ء کی اہم ادبی کتابیں ۔ایک جائزہ، خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ (انڈیا)جولائی۔ستمبر ۲۰۰۴ء شمارہ نمبر۱۳۷

۲۔ پاکستان میں ۲۰۰۵ ء کی اہم ادبی کتابیں۔ایک جائزہ، اردو دنیا نئی دہلی جون ۲۰۰۶ء

۳۔ ۲۰۰۶ء میں شائع ہونے والی پاکستانی کتب ، ماہ نامہ ایوان اردو نئی دہلی ،ستمبر ۲۰۰۷ء، پندرہ روزہ ''ہماری زبان'' نئی دہلی ، یکم تا ۷ اکتوبر ۲۰۰۷ء

۴۔ ۲۰۰۷ء کی اہم ادبی کتابیں، ماہ نامہ ایوان اردو نئی دہلی، جولائی ۲۰۰۸ء، ماہ نامہ قومی زبان کراچی، جولائی ۲۰۰۸ء

انٹرویو نگاری

۱۔ ممتاز مفتی سے ایک گفتگو

۲۔ سید قاسم محمود

۳۔ ڈاکٹر انوار احمد

۴۔ شہزاد منظر

۵۔ ڈاکٹر خلیق انجم

۶۔ امراؤ طارق

۷۔ شمس الرحمٰن فاروقی (انڈین نقاد)

۸۔ عبدالصمد (انڈین ناول نگار)

۹۔ ادیب سہیل

۱۰۔ منشا یاد

۱۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا

۱۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر

۱۳۔ حمید شاہد

۱۴۔ مسعود مفتی

۱۵۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی

کتب و تحقیقی مقالات

۱۔ ممتاز مفتی ایک مطالعہ، فیض پبلشرز، ملتان، ۱۹۹۷ء

۲۔ دیدبان، ہم عصر پبلی کیشنز ملتان، ۱۹۹۹ء

۳۔ ملتان میں اقبال شناسی، نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد، ۱۹۹۹ء

۴۔ اردو تحقیق: مسائل و رفتار، ہم عصر پبلی کیشنز ملتان، ۲۰۰۲ء

۵۔ ملتان کا عصری ادب، ہم عصر پبلی کیشنز ملتان، ۲۰۰۲ء

۶۔ اعتبار حرف، ایشیا پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۰۵ء

۷۔ پاکستانی ادب کی صورتحال، شہزاد منظر مرتب: اسد فیض، پورب اکیڈمی، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء

۸۔ منٹو کی گمشدہ تحریریں، شہزاد منظر / ڈاکٹر اسد فیض، کراچی، ۲۰۱۵ء

۱۰۔ حرف اعتبار (زیرِ طبع)

۱۱۔ مقالات رشید حسن خاں (زیرِ طبع)

۱۲۔ احمد ندیم قاسمی کے ابتدائی افسانے (زیرِ طبع)

۱۳۔ زندگی جبر ہے (سعادت حسن منٹو کے خطوط کا کلیات) (زیرِ طبع)

۱۴۔ تحقیق کی شعریات اور دوسرے مضامین (زیرِ طبع)

مرتب/ ایڈیٹر (ادبی و تعلیمی جرائد)

۱۔ فکر نو: ''فیض نمبر'' بہ حیثیت چیف ایڈیٹر، شعبہ اردو بہاء الدین ذکریا یونیورسٹی ملتان، ۱۹۸۸ء

۲۔ صناع ،ایڈیٹر اردو سیکشن گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی ملتان

۳۔ وژن ، چیف ایڈیٹر اسلام آباد ماڈل کالج فا ر بوائز ایف ٹین تھری اسلام آباد

۴۔ ہم عصر ملتان ،تحقیقی و ادبی جریدہ ،خصوصی شمارے، ملتان کا عصری ادب نمبر،ڈاکٹر طاہر تونسوی نمبر،جامعاتی تحقیق نمبر ،تین عام شمارے

۵۔ سپوتنک لاہور(ماہ نامہ) ،رفیق چوہدری نمبر،ممتاز مفتی نمر،ڈاکٹر رشید امجد نمبر،منشا یاد نمبر،

۶۔ ایڈیٹر ماہ نامہ جلترنگ ملتان

کھیلوں کی صحافت

۱۔ سٹاف رپورٹر(بہاولپور)ماہ نامہ سپورٹس انٹرنیشنل کراچی

۲۔ نامہ نگار (بہاولپور) ماہنامہ کھیل لاہور

۳۔ فیچر رائٹر سپورٹس انٹرنیشنل کراچی(ہاکی،کرکٹ کے کھلاڑیوں کے انٹرویو، ماہانہ سپورٹس رپورٹس

۴۔ روزنامہ امروز لاہور کھیلوں کے ایڈیشن پر قومی کھیلوں کے امور/ موضوعات پر مضامین

کالم نگاری

۱۔ آج کی بات،روزنامہ مغربی پاکستان، ملتان

۲۔ میرا کالم۔ماہ نامہ جلترنگ ملتان

۳۔ ٹیکنالوجی نامہ، ہفتہ وار تعلیمی ایڈیشن، روزنامہ نوائے وقت ملتان

۴۔ زکریایونیورسٹی شب و روز ،طلبا کا صفحہ روزنامہ امروز ملتان

سالانہ ادبی جائزے

۱۔ اردو کے اہم ادبی جرائد ۲۰۰۳ء ادبی ایڈیشن روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی

۲۔ ا۔اردو کے اہم ادبی جرائد ۲۰۰۴ء ادبی ایڈیشن روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی

۳۔ اردو کی اہم ادبی کتابیں ۲۰۰۴ء ادبی ایڈیشن روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی

۴۔ پاکستان میں ۲۰۰۵ء کی اہم ادبی کتابیں ایک جائزہ

۵۔ پاکستان میں ۲۰۰۶ء کی مطبوعہ ادبی کتب

۶۔ پاکستان میں۲۰۰۷ء کی مطبوعہ ادبی کتب

انٹرویو نگاری

۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا ، مطبوعہ اردو دنیا دہلی ،ماہ نامہ دستک کراچی جنوری ۲۰۰۷ء، ماہ نامہ الحمرا لاہور

۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر ، ماہ نامہ اردو دنیا ،دہلی،دستک کراچی دسمبر ۲۰۰۶ء

۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی،تخلیقی ادب نمل یونیورسٹی اسلام آباد شمارہ نمبر۲، ۲۰۰۵ء

۴۔ ممتاز مفتی،ماہ نامہ جلترنگ ملتان ،مشمولہ دید بان

۵۔ سید قاسم محمود ،ماہ نامہ جلترنگ ملتان،مشمولہ دید بان

۶۔ مسعود مفتی،ماہ نامہ دستک کراچی نومبر ۲۰۰۶ء،الحمرا لاہور

۷۔ رشید امجد،اردو دنیا دہلی،دستک کراچی مارچ ۲۰۰۷ء،اسالیب سرگودہا جولائی تا ستمبر۲۰۱۰ء

۸۔ منشا یاد، دستک کراچی، ستمبر ۲۰۰۶ء، ماہ نامہ جلترنگ ملتان، ماہ نامہ اردو دنیا، دہلی

۹۔ ڈاکٹر اسلم انصاری، ماہ نو لاہور،

۱۰۔ حمید شاہد، ماہ نامہ دستک کراچی، ماہ نامہ جلترنگ ملتان

۱۱۔ ڈاکٹر خلیق انجم، ماہ نامہ جلترنگ ملتان

۱۲۔ ڈاکٹر انوار احمد، ہم عصر ملتان، ماہ نامہ قومی زبان کراچی، جنوری ۲۰۱۴ء

۱۳۔ اے خیام ، ماہ نامہ الحمرا لاہور، مئی ۲۰۰۹ء

۱۴۔ مظہر کلیم ۔ ہم عصر ملتان نمبر

۱۵۔ ادیب سہیل، مشمولہ دیدبان

۱۶۔ شہزاد منظر، مشمولہ دید بان، ماہ نامہ جلترنگ ملتان

۱۷۔ مشفق خواجہ سے ایک ملاقات، ماہ نامہ کتاب اسلام آباد،

نگران تحقیقی مقالہ (ایم فل)

۱۔ خدابخش لائبریری جرنل انڈیا اور اقبال شناسی، شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد ۲۰۰۸ء

۲۔ پاک چین دوستی کے فروغ میں اردو زبان کا کردار، شعبہ اردو ، اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

بیرونی ممتحن تحقیقی مقالات ایم فل، ایم اے

۱۔ سیاسیات برصغیر میں علی گڑھ تحریک اور اقبال کے کردار کا تقابلی و تجزیاتی مطالعہ (ایم فل) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد ۲۰۰۷ء

۲۔ ڈاکٹر محمد امین کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ، (ایم اے) سرگودھا یونیورسٹی سرگودھا ۲۰۰۹ء

۳۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقیدی جہات،(ایم اے اردو)سرگودہا یونیورسٹی سرگودھا،۲۰۰۹ء

۴۔ اردو کے تین مزاح نگاروں کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ (ایم اے اردو) سرگودھا یونیورسٹی سرگودھا

۵۔ مجلس ترقی ادب کی بیس سالہ خدمات(ایم اے اردو) سرگودہا یونورسٹی سرگودھا ۲۰۱۰ء

حواشی و حوالہ جات

ا۔فیض محمد چوہدری(والد ڈاکٹر اسد فیض) سے ایک مکالمہ بہ مقام ۶۵۔سی شاہ رکن عالم، ہاؤسنگ سکیم ملتان ،بتاریخ ۱۰ نومبر ۲۰۱۶ء

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً

۶۔فیض محمد چوہدری،''میں نے پاکستان بنتے دیکھا''،روزنامہ نوائے وقت ملتان ،مورخہ ۷ اگست ۱۹۹۷ء، ص ۱۵

۷۔فیض محمد چوہدری سے ایک مکالمہ، حوالہ سابقہ

۸۔ ایضاً

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ ایضاً

۱۳ ۔ڈاکٹر اسد فیض سے ایک مکالمہ، بمقام سواں گارڈن اسلام آباد مورخہ ۱۵ دسمبر ۲۰۱۶ء

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ اسد فیض،احمد ندیم قاسمی بنام اسد فیض،قومی زبان، ماہ نامہ۔کراچی،جلد ۸۲،شمارہ ۷،جولائی ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۔۱۶

۱۷۔اسد فیض سے ایک مکالمہ، حوالہ سابقہ

۱۸۔اسد فیض ،ممتاز مفتی بنام اسد فیض ،ماہ نو (ماہ نامہ)لاہور،جلد ۶۷،شمارہ نمبر ۳ ،جولائی تا اگست ۲۰۱۳ء،ص ۱۳

۱۹ فیض محمد چوہدری سے ایک مکالمہ، حوالہ سابقہ

۲۰۔آصف فیض سے ایک مکالمہ، بہ مقام ۶۵۔سی شاہ رکن عالم ہاؤسنگ سکیم ملتان ،بتاریخ ۱۰ نومبر ۲۰۱۶ء

۲۱۔ڈاکٹر طاہر تونسوی ،مشمولہ ملتان کا عصری ادب،ہم عصر پبلی کیشنز ملتان،، آخری صفحہ

۲۲۔اسد فیض سے ایک مکالمہ، حوالہ سابقہ

۲۳۔ممتاز مفتی ،ہند یاترا ،الفیصل ناشران لاہور،۱۹۹۲ء،ص۱۰۳

۲۴۔اسد فیض،مشاہیر کے خطوط ،قومی زبان ،ماہ نامہ،کراچی،جلد ۸۷،شمارہ ۷،ص۴۷

۲۵۔جاوید اصغر،اسد فیض،نگر نگری پھرنے والا مسافر، پاکستان،روزنامہ ملتان،۲۷ نومبر ۲۰۰۹ء،ص ۱۲

۲۶۔اسد فیض سے ایک مکالمہ، حوالہ سابقہ

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ ایضاً

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ ایضاً

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ ایضاً

۳۳۔ڈاکٹر سلیم اختر کا خط بنام اسد فیض،تاریخ ندارد مخزونہ اسد فیض

۳۴۔ڈاکٹر روبینہ شاہین/غنچہ بیگم،مکاتیب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بنام ڈاکٹر اسد فیض،مجلّہ خیابان پشاور، بہار ۲۰۱۳ء

۳۵۔اسد فیض،اشاریہ بادبان کراچی،مشمولہ اخبار اردو،ماہ نامہ اسلام آباد،جلد ۳۰،شمارہ نمبر ۹،ستمبر ۲۰۱۲ء

۳۶۔ڈاکٹر اسد فیض سے ایک مکالمہ،حوالہ سابقہ

۳۷۔ ایضاً

۳۸۔ ایضاً

۳۹۔ ایضاً

۴۰۔ ایضاً

۴۱۔جاوید اصغر،''دیدبان'' مشمولہ،اردو بک ریویو ،دو ماہی،دہلی،جلد ۴،شمارہ ۴۹۔۵۰، نومبر۔دسمبر ۱۹۹۹ء،ص۲۹

۴۲۔ادیب سہیل،قومی زبان،ماہ نامہ،کراچی،ستمبر ۲۰۰۰ء، جلد۲۷،شمارہ نمبر۹،صفحہ ۸۳

۴۳۔مطہر شاہ،غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو ''اردو فن تحقیق پر مواد کا تحقیقی و توضیحی جائزہ''، مخزونہ ،قرطبہ یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خاں،۲۰۰۹ء،ص ۱۸۸

۴۴۔ڈاکٹر اسد فیض،دیباچہ مشمولہ اعتبارِ حرف ،ایشیا پبلشرز،فیصل آباد،ص ۷

۴۵۔ڈاکٹر اسد فیض،دیباچہ مشمولہ ''پاکستان میں اردو ادب کی صورت حال'' ،پورب اکادمی اسلام آباد،ص ۵

۴۶۔فیاض،ایم۔ خالد،منٹو کی گمشدہ تحریریں،ماہ نامہ ،اردو دنیا،دہلی،جلد ۱۷،شمارہ نمبر ۸،اگست ۲۰۱۵ء،ص۴۷

۴۷۔حمیرا اظہر،منٹو کی گم شدہ تحریریں۔ایک مطالعہ، مشمولہ جناح،روزنامہ ،کراچی،سوموار ۱۶ نومبر ۲۰۱۵ء،

۴۸۔انور سدید،ڈاکٹر،انجمن خیال،ماہ نامہ تخلیق،لاہور،اکتوبر ۲۰۰۳ء ص ۱۱۰

۴۹۔انور سدید،ڈاکٹر،انجمن خیال،ماہ نامہ تخلیق،لاہور،دسمبر ۲۰۰۳ء ص۱۵۲

۵۰۔خواجہ محمد زکریا،ڈاکٹر، محفل احباب، الحمرا،ماہ نامہ،لاہور ،جلد ۱۰،شمارہ نمبر ۹،ستمبر ۲۰۱۰ء، ص۱۲۸

۵۱۔اسد فیض ،ڈاکٹر،محفل احباب، الحمرا،ماہ نامہ،لاہور ،جلد ۱۰،شمارہ،۱۰،اکتوبر ۲۰۱۰ء،ص۱۱۵

۵۲۔انور سدید،ڈاکٹر،محفل احباب، الحمرا،ماہ نامہ،لاہور ،جلد ۱۰،شمارہ،۹،ستمبر ۲۰۱۰ء،ص۱۲۶

۵۳۔یہ مضمون خدا بخش لائبیریری جرنل پٹنہ ،انڈیا، کے شمارہ ۱۶۲ ،اکتوبر ۔دسمبر ۲۰۱۰ ء میں شائع ہوا۔

۵۴۔عالی، جمیل الدین،نقار خانے میں ،روزنامہ جنگ کراچی،۱۳ فروری،۲۰۱۱ء،ص ۱۱

باب دوم:

اسد فیض کی اقبال شناسی

ڈاکٹر اسد فیض کے جہاں اور بہت سے تحقیقی اور تنقیدی میدان ہیں وہاں اقبال اُن کا ایک پسندیدہ میدان ہے۔ اس ذیل میں اگرچہ اُن کے کچھ مطبوعہ مقالات بھی اہمیت کے حامل ہیں مگر سب سے اہم کام اُن کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جو بعد میں ''ملتان میں اقبال شناسی'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں ملتان میں اقبال شناسی کی پوری روایت کا جس طرح جائزہ لیا گیا ہے شاید ہی کہیں اور ایسا جائزہ لیا گیا ہو یا لیا جا سکتا ہو۔

اقبال پر ہمارے ہاں اور ہندوستان میں بے شمار تحقیقی اور تنقیدی کام ہو چکا ہے کہ اب شاید اقبال کی کسی جہت پر کام کرنے کی گنجائش باقی ہی نہیں رہی لیکن یہ کام ہونا باقی ہے کہ مختلف شہروں اور علاقوں میں اقبال پر کیسا اور کس نوعیت کا کام ہوا ہے۔ یہ بذاتِ خود ایک دلچسپ تحقیقی کام ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ مختلف علاقوں کے محققین کی اقبال کے حوالے سے دلچسپی کا بنیادی رجحان کیا رہا ہے اور انہوں نے اقبال کو کس کس زاویے سے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر اسد فیض نے اسی دلچسپی کے پیشِ نظر ملتان میں ہونے والے اقبال کے حوالے سے تحقیقی کام کو اپنا موضوع بنایا ہے ۔ اُن کے اس کام سے پتہ چلتا ہے کہ ملتان میں کس کس محقق نے اقبال کے کن کن موضوعات پر قلم اٹھانا پسند کیا اور ملتان تو ایک طویل تہذیبی اور علمی روایت کا حامل شہر ہے ، وہاں اقبالیات کے شعبہ میں کیا کیا ترقی ہوئی یہ جاننا علمی حوالوں سے یوں بھی بہت اہم ہے۔

''ملتان میں اقبال شناسی'' اصل میں ڈاکٹر اسد فیض کا ایم فل کا تحقیقی مقالہ ہے جسے انہوں نے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے ۔ پہلا باب بنیادی طور پر ملتان کی ادبی و ثقافتی تاریخ کے عنوان سے ہے ۔ اس میں ملتان کی ادبی و ثقافتی تاریخ کو اجاگر کیا گیا ہے اور مقالہ کے اختتام تک ملتان میں شعر و ادب اور صحافت کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ذیلی باب بعنوان'' ملتان میں اقبال شناسی کے اولین نقوش'' میں ملتان میں علامہ اقبال کے حوالے سے اولین تحریروں کا کھوج لگایا گیا ہے اور اقبالیات کے ذیل میں ملتان کی اہمیت اور کردار پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرے باب کا عنوان'' ملتان میں اقبالیات کا ارتقا'' ہے۔ اس میں آغاز سے اب تک علامہ اقبال

کے بارے میں لکھی جانے والی کتب ، علامہ اقبال کی پیروی میں شعر کہنے اور انہیں اپنے اشعار میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے والے شعرا کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ اس کے ذیلی باب کا عنوان '' ملتان میں علاقائی زبانوں میں اقبالیاتی تنقید اور کلامِ اقبال کے تراجم'' ہے۔ اس باب میں سرائیکی اور پنجابی زبان میں اقبالیات پر لکھی جانے والی کتب اور مقالات کا ایک جائزہ لیا گیا ہے اور منظوم تصانیف و تراجم کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

تیسرے باب کا عنوان '' ملتان میں ناقدانِ اقبال : ایک جائزہ'' ہے۔ اس میں ملتان میں لکھی جانے والی اقبالیاتی تنقید اور ناقدین پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اور اقبالیات کے شعبہ میں اس کا معیار متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چوتھا باب جو'' ملتان میں اقبالیاتی ادب کے فروغ میں اداروں کا کردار'' کے عنوان سے ہے ، اس میں ملتان میں فروغِ اقبالیات میں سرگرمِ عمل اداروں اور اُن کی کارکردگی کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ملتان کی مختلف اور اہم تعلیمی درس گاہوں کے مجلوں میں اقبالیات کے مندرجات کا اشاریہ مرتب کیا گیا ہے۔

پانچویں باب میں'' ملتان میں اقبال شناسی کا مجموعی جائزہ'' میں ملتان میں فکرِ اقبال کی تفہیم و تشریح کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کا مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں خطۂ ملتان سے تعلق رکھنے والی شخصیات کی علامہ اقبال سے ملاقاتوں کا احوال بھی رقم کیا ہے ۔ ڈاکٹر اسد فیض لکھتے ہیں :

> ''فکرِ اقبال؛ فلسفہ، منطق، تاریخ ، مذہب، نفسیات اور مابعد الطبیعات کے معروف نظریات کا تجزیہ کرتی ہے ۔ یہ فکر اپنی وسعت اور اثر پذیری کے اعتبار سے اس وقت تمام دنیا میں ، ایک صحت مند فلسفہ کی حیثیت سے متعارف ہو چکی ہے ۔''(۱)

یہ تحقیقی مقالہ ملتان میں ہونے والی اقبال شناسی کی ایک ایسی دستاویز بن گیا ہے کہ اب اس موضوع پر کام کرنے والے کے لیے یہ حوالہ کا کام دے گا۔ یہ ملتان کی ادبی اور ثقافتی اہمیت او رحیثیت کا بھی تعین کرتا ہے۔ ملتان کی ادبی اور ثقافتی تاریخ معلوم کرنے کا ایک اہم حوالہ بھی اب یہ کتاب بنے گی ۔ ہمیں اس

کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملتان ہزاروں سال سے اہم تہذیبوں کا گہوارہ اور مرکز رہا ہے ۔محمود غزنوی کے عہد میں البیرونی نے برسوں ملتان میں قیام کیا اور'' کتاب الہند'' لکھی ۔محمود غزنوی کے بعد حضرت شاہ گردیز ملتان تشریف لائے اور ایک طرف انہوں نے تبلیغ کے ذریعے اسلامی علوم کی ترویج کی کوششیں کیں تو دوسری طرف انہوں نے ملتان میں کتب خانے کی بنیاد رکھ کر پہلی بار ملتان کو علمی خزانے کی اہمیت سے آشنا کیا۔۱۲۰۲ء سے ۱۲۲۷ء تک یہاں ناصر الدین قباچہ کی حکومت رہی یہ اور ملتان کی تاریخ کا ایک سنہرا باب جانا جاتا ہے ۔(۲)اس عہد میں علمی اور ادبی محفلیں یہاں عروج پر ہیں ۔ ڈاکٹر روبینہ ترین اس کی وجہ یوں بتاتی ہیں ،لکھتی ہیں :

''وسطِ ایشیا میں مغلوں کے قتلِ عام کی وجہ سے فرار پانے والے امرا اور فضلا سب سے پہلے ملتان پہنچتے تھے، جہاں شہزادہ محمد کی علم پروری اور جوہر شناسی انہیں ہمیشہ کے لیے وہاں کا بنا دیتی تھی ۔''(۳)

امیر خسرو (بھی) پانچ سال ملتان میں رہے۔ اس دور میں ملتان کو بلا شبہ یگانۂ روزگار ہستیوں کا شہر ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے ۔'' علمی و ادبی سرگرمیوں کے علاوہ اس زمانہ میں حضور غوث بہاء الدین زکریا یہاں جلوہ افروز ہوتے ہیں ۔جن کے نور وعرفان سے تمام وسطِ ایشیا جگمگا اٹھتا ہے۔'' (۴)

پھر بزرگانِ دین کا ایک سلسہ ہے جو خطۂ ملتان کا مقدر بنتا ہے اور اس کی پہچان بھی ۔جس سے ملتان کی نہ صرف تہذیبی بلکہ ادبی روایت کو بھی ایک تقویت ملتی ہے اور آنے والے عہد کی ادبی روایت کی بنیاد بنتی ہے ۔

ملتان میں اُردو شاعری سے قبل شعرا عربی ، فارسی اور ملتانی زبان میں شعر کہتے تھے ۔ بقول ڈاکٹر طاہر تونسوی :

'' ملتانی شاعری کا نمونہ سب سے پہلے ' نور نامہ ' کی شکل میں ملتا ہے ، جسے حافظ محمود شیرازی ۱۰۵۴ء کی تصنیف قرار دیتے ہیں ۔''(۵)

بابا فرید گنج شکر جن کی عطایہ ہے کہ'' انہوں نے پنجاب کی سرزمین سے اُردو میں تخلیقِ شعر کا عمل جاری کیا۔'' (۶)اس طرح اُن کے علاوہ امیر خسرو ، امیرحسن سنجری اور شیخ علی متقی کو دورِ اول کے شعرا ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

انیسویں صدی میں خطہ ٔملتان کے ایک عظیم صوفی شاعر خواجہ غلام فرید ہیں جو بنیادی طور پر سرائیکی زبان کے شاعر ہیں اُن کی شاعری میں تصوف، رشد و ہدایت انسان دوستی اور اخلاق کے انمول خزانے موجود ہیں ۔ ڈاکٹر اسد فیض لکھتے ہیں :

> '' علامہ اقبال اور خواجہ غلام فرید کے خیالات میں بہت سی اقدار مشترک ہیں مثلاً دونوں شاعر عقل پر عشق کو فضیلت دیتے ہیں ، دونوں رجائی اور امید پرست شاعر ہیں اور دونوں کے یہاں حرکت و عمل کی تلقین ملتی ہے ۔''(۷)

علامہ اقبال کا خواجہ غلام فرید کی شاعری کے بارے میں کہنا ہے :

> ''افسوس کہ خواجہ ساحب کی شاعری ایک علاقے تک محدود ہو کر رہ گئی ۔ ان کا کلام ایک گہرے مطالعے کا محتاج ہے۔ مجھے تو اس میں بین الاقوامی حیثیت کے عناصر نظر آتے ہیں ۔''(۸)

غرض یہ کہ ملتان میں ادبی اور ثقافتی روایت کی مضبوط جڑیں ہیں ۔ شعر وشاعری ،تصوف، صحافت : ہر میدان میں ملتان نے اپنی برتری کو ثابت کیا اور اپنی الگ شناخت کو قائم کیا۔ ڈاکٹر اسد فیض کا یہ نتیجہ بالکل درست ہے کہ :

> '' ملتان میں تخلیق ہونے والے ادب و نثر پر ایک نظر ڈالی جائے تو اس میں اس عظیم دھرتی کی بو باس اور الگ شناخت موجود ہے ، اس لیے

اسے دبستان ملتان کے نام سے موسوم کیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔''(۹)

'' ملتان میں اقبال شناسی کے اولین نقوش'' اس حوالے سے اہم ذیلی باب ہے کہ اس میں بڑی تحقیق سے یہ بتایا گیا ہے کہ ملتان میں اقبال شناسی کے اوّل اوّل نقوش کیا ہیں ۔ مثلاً سب سے پہلے ''ساقی''، ''نخلستان''، '' باغ و بہار'' اور ہفت روزہ '' اقبال'' کا اجرا ہوا تو اقبالیات کا آغاز ہو گیا ۔ پھر یہاں ''بزمِ اقبال'' قائم ہوئی جس کے تحت مشاعرے اور تقاریب منعقد ہوتی رہیں ۔ ڈاکٹر اسد فیض کے بقول ''ملتان میں اقبال کے بارے میں لکھی جانے والی پہلی منظوم تخلیق اسد ملتانی کی ایک نظم ہے ، جو فارسی زبان میں لکھی گئی ہے اور فروری ۱۹۳۰ء کے '' معارف'' اعظم گڑھ میں شامل ہوئی ۔''(۱۰)جب کہ نثر میں ملتان سے شائع ہونے والی علامہ اقبال پر پہلی تصنیف بقول اسد فیض '' ملت اور وطن'' کے عنوان سے شائع ہونے ولا ایک کتابچہ ہے جو ۱۶ مارچ ۱۹۳۸ء کو ادارہ روزنامہ ''شمس'' ملتان نے شائع کیا۔'' (۱۱)

اسد ملتانی کا ''مرثیہ اقبال'' اقبالیات کے ذیل میں ایک اور اہم کڑی ہے پھر اسد ملتانی کا اقبال پر مضمون غرض یہ کہ اقبال پر ابتدائی تحریروں میں اسد ملتانی کا بہت اہم کردار ہے ۔

اس کتاب کا اصل آغاز دوسرے باب سے ہوتا ہے۔جس کو دو ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے :

(الف) ملتان میں اقبالیات کا ارتقا

(ب) ملتان میں علاقائی زبانوں میں اقبالیاتی تنقید و تراجم ۔

پہلے ذیلی عنون کو مزید دو عنوانات میں ترتیب دے دیا گیا ہے ۔ یعنی '' اقبالیاتی شاعری'' اور ''اقبالیاتی نثر''۔

'' اقبالیاتی شاعری'' کے ذیل میں ڈاکٹر اسد فیض نے ملتان میں ہونے والی اقبال سے متاثرہ یا اقبال پر کی گئی شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے ۔ ملتان کے مختلف مشاعروں نے اقبال کے کیسے کیسے اثرات قبول کیے اور اقبال کو کس کس طرح خراجِ تحسین پیش کیا ، یہ اس باب کا حصہ ہے۔

سب سے پہلے اسد ملتانی کا ذکر ہے جنھوں نے صحیح معنوں میں اقبال کی پیروی کی اور اقبالیات کے فروغ میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ اسد ملتانی نے علامہ اقبال کے بارے میں متعدد نظمیں لکھیں ۔ ایک نظم میں وہ اقبال کو یوں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

شاعروں سے اونچا مقام اقبال کا
کیوں کہ ہم آہنگ قرآں ہے کلامِ اقبال کا(۱۴)

ڈاکٹر اسد فیض اُس نظم کا بھی بطورِ خاص ذکر کرتے ہیں جو اسد ملتانی نے ''یار اقبال'' کے عنوان سے لکھی اور جس میں اسد ملتانی نے علامہ اقبال کی رحلت کو عالمِ اسلام کے لیے ایک عظیم سانحہ قرار دیا ہے اور ان کے فکر و فلسفہ کو لا زوال قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کے لیے اس کی پیروی کی تلقین کی ہے۔ اسی وجہ سے یہ نظم قابلِ ذکر بن جاتی ہے۔

اسد ملتانی کے حوالے سے ایک واقعہ کا ذکر بڑا غور طلب اور بحث طلب ہے مگر ڈاکٹر اسد فیض نے اس پر بحث اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی جب کہ یہ معاملہ نپٹانا ضروری تھا۔ ڈاکٹر اسد فیض لکھتے ہیں :

> '' طلوعِ اسلام' کے مئی ۱۹۵۰ء کے شمارے میں ایک نظم 'کلامِ اقبال کا انگریزی ترجمہ' کے عنوان سے شائع ہوئی ۔ اس میں اسد ملتانی نے تاسف کا اظہار کیا ہے کہ علامہ اقبال کے کلام کو انگریزی میں ڈھالنے کی تیاری ہے لیکن یہ کیسا دستور ہے کہ ہم اپنے شاعر کی فکر سے استفادہ کرنے کے بجائے دوسری اقوام کو یہ عظیم سرمایہ منتقل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔''(۱۵)

اور پھر اسد ملتانی اس شعر کے ذریعے اپنے متمعِ نظر کا اظہار کرتے ہیں ، کہتے ہیں :

مسلمانانِ پاکستان شاید چاہتے یہ ہیں
کہ خود سوتے رہیں دنیا کو دیں پیغامِ بیداری (۱۶)

اب یہاں بحث طلب نقطہ یہ تھا کہ کیا کسی اور زبان میں کسی شاعر کے کلام کا ترجمہ کرنے کا کیا وہی مطلب ہوتا ہے جو اسد ملتانی نے سمجھا؟ ایسا نہیں ہے ۔ یہ بات نہیں ہے کہ اقبال کا کلام انگریزی میں اس

لیے ترجمہ ہو رہا تھا یا ہو رہا ہے کہ اس کلام سے ہم خود نہیں بلکہ دوسروں کو استفادہ کا موقع دے رہے ہیں یا اپنا سرمایہ دوسری اقوام کو منتقل کر رہے ہیں بلکہ یہ ہے کہ ہمارے بڑے شاعر کی آواز اور پیغام کو دوسری اقوام بھی سنیں اور جانیں تاکہ انہیں معلوم ہو سکے کہ اس قوم کی رہبری کس فکر کے حامل مفکر اور شاعر کر رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہماری قوم کس قدر بڑے شاعر جنم دینے کی اہلیت رکھتی ہے، دوسری اقوام کو اس سے آگاہ کیا جائے۔ ہم اگر اپنا بڑا ادب اور تخلیق ترجمہ نہیں کریں گے تو دوسری اقوام اس سے واقف کیسے ہوں گی۔ لہٰذا اسد ملتانی کو یہ بات سمجھنی چاہیے تھی اور تاسف کا اظہار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی ۔

اسد ملتانی نے پیرویٔ اقبال میں بھی بہت سے موضوعات پر طبع آزمائی کی اور اسد بعض نظموں کی بنیاد اقبال کے مصرعوں اور اشعار پر رکھتے ہیں ، اس کے علاوہ وہ اقبال کے اشعار کو بطورِ تضمین بھی استعمال کرتے رہے۔ ان سب کی مثالوں کو پیش کر کے ڈاکٹر اسد فیض نے اسد ملتانی کی شاعرانہ خصوصیات کو واضح کیا ہے ۔ اُن کا اسد ملتانی کے بارے میں یہ کہنا بالکل درست ہے کہ:

> ’’ بیسویں صدی میں اسد ملتانی وہ پہلے اور اہم شاعر ہیں جنہوں نے کلامِ اقبال اور فکرِ اقبال کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس کیا اور نہ صرف اس کے فروغ کا باعث بنے بلکہ اُن کی شاعری کو دیکھ کر یہ با آسانی کہا جا سکتاہے کہ ان کی شاعری فکرِ اقبال کی تشریح وہ توسیع بھی ہے۔۔۔ مجموعی طور پر اسد ملتانی کی نظم و نثر علامہ اقبال ، اسلام اور پاکستان سے والہانہ محبت کی آئینہ دار ہے ۔ ادب، صحافت اور اقبالیات کے میدان میں نصف صدی پر محیط اسد ملتانی کی خدمات ایک قیمتی خزانہ اور اثاثہ ہیں ، جنہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔‘‘(۱۷)

اسد ملتانی کے بعد ڈاکٹر اسد فیض نے علامہ عبدالرشید نسیم طالوت کو اقبالیات کے حوالے سے دوسری اہم شخصیت قرار دیا ہے جنہوں نے علامہ اقبال کی زندگی کے آخری ایام میں مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال کے مابین ملت اور وطنیت کے موضوع پر تنازعہ میں مصالحتی کردار ادا کیا اور اپنی کوششوں سے اس قضیہ کو انجام تک پہنچایا ۔

عبدالرشید نسیم طالوت کے بعد اقبالیاتی ادب کے ذیل میں ایک اہم نام اسلم انصاری کا ہے۔ انہوں نے اقبال کو اپنی فارسی مثنوی '' فرخ نامہ'' میں علامہ اقبال کو اپنا مرشد و رہنما مانا ہے۔ اسلم انصاری نے واضح الفاظ میں اس بات کا اقرار کیا کہ '' میرے ذہن کی تشکیل میں علامہ اقبا ل نے اہم کردار ادا کیا وہ میرے آئیڈیل ہیں ۔''(۱۸) اسلم انصاری کا علامہ اقبال کو یہ خراجِ تحسین قابلِ ستائش ہے:

فکرِ اقبال ہے ایک گنجِ گہر
جو بھی دیکھے گا اقبال کے سب مقاماتِ فکر ونظر
اس کو احساس ہو گا کہ اقبال نے
پردۂ لفظ میں
پیکرِ شعر میں
کیسے گہرے مفاہیم پنہاں کیے
کیا مطالب تھے جن کو زباں بخش دی''(۱۹)

اسلم انصاری کے بعد ڈاکٹر اسد فیض نے عاصی کرنالی ، ارشد ملتانی ، جابر علی سید ، رفیق خاور جسکانی ، پروفیسر حسین سحر ، پروفیسر صفدر حسین صفدر ، ڈاکٹر طاہر تونسوی ، فخر الدین بلے ، لالہ بال کشن ترہ ابر ، کشفی ملتانی ، بھیم سین ظفر ادیب ، راجہ محمد عبد اللہ نیاز اور عبد الطیف تپش کی اقبال شناسی کے ذیل میں خدمات کا جائزہ لیا ہے ۔ ان شعرا نے کس کس طرح اقبال کے حضور اپنا نذرانہ عقیدت پیش کیا، مثالیں دیکھیے:

عاصی کرنالی کہتے ہیں :

لو فکر کی ہر ذہن کو چھوتی ہی رہے گی
ہر عہد ہے اقبال کی پیغام بری کا (۲۰)

ارشد ملتانی کا خراجِ عقیدت ملاحظہ کیجیے:

وہ ایک مردِ قلندر کہ جس کا سوز نوا
حیاتِ نو کے تقاضوں سے ہم کلام ہوا

طلسم تیرہ شبی کا اسیر تھا جو افق
طلوعِ صبح درخشاں سے نالہ عام ہوا (۲۱)

ڈاکٹر طاہر تونسوی کہتے ہیں :

مجھے خبر ہے
یہ میرے وجدان نے کہا
وہ عقل و دانش کا ایک شجر ہے
وہ جس کی شاخوں نے فہم و ادراک کو بھی
جوشِ جمال بخشا (۲۲)

جابر علی سید کا اظہارِ عقیدت یوں راہ پاتا ہے :

اے فلسفہ آشنائے عالم
حکمت آموز سعیٔ پیہم

تھا درس ترا حقیقت آموز
اور تری نوا حیات افروز (۲۳)

اور صفدر حسین صفدر یوں رقم طراز ہیں :

جن افکار کا ایک تاج محل ہے اقبال
نغمہ اہلِ قلم ساز غزل ہے اقبال

رہبر جادہ اقوام و ملل ہے اقبال
شام کردار نہیں صبحِ عمل ہے اقبال (۲۴)

''اقبالیاتی نثر'' کے حوالے سے ملتان میں جن محققین کے کاموں کو ڈاکٹر اسد فیض نے موضوعِ بحث بنایا ہے اُن میں محمد اکرم خاں،منشی عبدا لرحمٰن ، پروفیسر افتخارحسین شاہ ، ڈاکٹر طاہر تونسوی ، ڈاکٹر اے بی اشرف، پروفیسر جابرعلی سید، ڈاکٹر ایس ایم منہاج الدین ، پروفیسر اسلم انصاری ، مولانا نور احمد خان فریدی ، ڈاکٹرعبدالرؤف شیخ، ڈاکٹر انوار احمد اورعبدا لمجید ساجد کے نام شامل ہیں ۔

محمد اکرم خاں جو روزنامہ ''شمس'' کے مدیر تھے ، اقبالیاتی نثر میں اس حوالے سے اہمیت رکھتے ہیں کہ اُن کی تحریر'' ملت اور وطن'' ملتان میں علامہ اقبال کے بارے میں لکھی جانے والی پہلی نثری تحریر ہے ۔ ڈاکٹر اسد فیض نے اسی اہمیت کے پیشِ نظر اس تحریر کا مکمل تعارف کرایا ہے۔

ڈاکٹر اسد فیض کے مطابق ۱۹۵۵ ء میں ملتان میں علامہ اقبال پر پہلی کتاب شائع ہوئی ۔ یہ منشی عبدالرحمٰن نے ''اقبال اور مسٹر'' کے عنوان سے لکھی ۔(۲۵) یہ کتاب اصل میں انہوں نے خلیفہ عبدالحکیم کے کتابچہ ''اقبال اور ملاّ'' کے جواب میں لکھی تھی۔ اس کتاب میں منشی عبدالرحمٰن نے خلیفہ عبدالحکیم کے ملا کے بارے میں لگائے گئے الزامات کا مدلل انداز میں جواب دیا ہے۔منشی عبد الرحمٰن لکھتے ہیں :

''خلیفہ صاحب جس نظریہ کو اقبال کا نظریہ ظاہر کر رہے ہیں وہ فی الحقیقت اقبال کا نظریہ نہیں بلکہ وہ خود خلیفہ صاحب کا نظریہ ہے جسے وہ اقبال کی آڑ میں پیش کر رہے ہیں ۔ علما جن اصولوں پر پاکستان کی بقا و تہذیب کے خواہاں ہیں انہی اصولوں پرعمل پیرا ہو نے کی اقبال بھی دعوت دیتے ہیں ۔''(۲۶)

منشی عبدالرحمٰن نے اسی کتاب کے علاوہ دیگر اہم مضامین بھی لکھے جن کی اقبالیات کے شعبہ میں ایک خاص اہمیت ہے ۔ ڈاکٹر اسد فیض نے اسی لیے ان مضامین کی نہ صرف تفصیل درج کی ہے بلکہ اُن کے موضوع کو بھی بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر اسد فیض کا منشی عبدالرحمٰن کے بارے میں یہ تجزیہ بڑی حد تک لائق توجہ ہے ، وہ لکھتے ہیں :

> ''منشی عبد الرحمٰن نے بے حد دلیری اور سچائی کے ساتھ ان افراد اور اداروں کا محاسبہ کیا ہے ، جو علامہ اقبال اور فکرِ اقبال کو صرف اپنی دوکان داری چمکانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور اصل پیغام سے انہیں کچھ سروکار نہیں ۔''(۲۷)

پروفیسر افتخار حسین شاہ کی کتاب '' اقبال اور پیرویٔ شبلی'' کو بھی ڈاکٹر اسد فیض نے اُس کے موضوع کے حوالے سے بہت سراہا ہے اور ملتان کے اقبالیاتی ادب میں ایک اہم اضافہ قرار دیا ہے جو بجا بھی ہے۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن دہلی انڈیا سے بھی شائع ہوا ۔ اس کتاب میں پروفیسر افتخار حسین شاہ نے علامہ اقبال اور شبلی نعمانی کے مابین ذہنی وفکری مماثلتوں کی نشاندہی کی ہے ۔ پروفیسر افتخار حسین شاہ نے بھی اقبال پر بہت سے دیگر مضامین لکھے ۔ ڈاکٹر اسد فیض نے اُن کی تفصیل بھی بڑی محنت سے مرتب کر دی ہے ۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اقبال پر کئی کتابیں مرتب کی ہیں اور اقبالیاتی تنقید کو بے حد ثروت مند بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر اسد فیض اُن کی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں ، لکھتے ہیں :

> '' اقبالیاتی ادب میں اُن کا (ڈاکٹر طاہر تونسوی کا) اہم کار نامہ قدیم اور نایاب مضامین کو الگ الگ عنوانات کے تحت کتابوں کی صورت میں مرتب کرنا ہے ۔''(۲۸)

ایک اہم کام ڈاکٹر اے ۔بی اشرف نے سرانجام دیا۔ ڈاکٹر این میری شمل نے ملتان یونیورسٹی میں وقتاً فوقتاً اقبال پر چار لیکچر دیے تھے ۔ ڈاکٹر اے بی اشرف نے ان لیکچرز کو '' لیکچرز آن علامہ اقبال'' کے

عنوان سے مرتب کر دیا ۔ یہ خاصے کی چیز ہے ۔ ان میں سے ایک لیکچر کا ترجمہ'' اوراق'' کے ایک شمارہ میں دیکھنے کا اتفاق ہوا تو ان کی اہمیت کا احساس ہوا۔(۲۹)

جابر علی سید کی کتابوں کی افادیت یہ ہے کہ یہ طبع زاد تنقیدی کتابیں ہیں ۔ ڈاکٹر اسد فیض نے کتابوں میں شامل تمام مضامین کی فہرستیں بھی درج کی ہیں تاکہ پتہ چل سکے کہ جابر علی سید نے اقبال کے فکر وفن کی کن کن جہتوں سے معاملہ کیا ہے اور اس فہرست سازی سے ہم جابر علی سید کی ان کتابوں کی افادیت سے بہ خوبی آگاہ ہو جاتے ہیں ۔

غرض یہ کہ ڈاکٹر اسد فیض نے اس ذیلی باب میں اقبالیاتی نثر سے متعلق طبع زاد اور مرتبہ ہر دو اہم تحقیقی اور تنقیدی کاموں کا مفصل جائزہ پیش کر کے بلاشبہ ملتان میں اقبالیات کا ایک جامع خاکہ مرتب کر دیا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے ملتان میں ہونے والے علاقائی زبانوں میں اقبالیاتی تنقید اور تراجم کو موضوع بحث بنایااور یہاں بھی پوری تفصیل سے بتایا کہ سرائیکی اور پنجابی میں اقبالیات کے ذیل میں کیا کیا اہم کام سرانجام دیے گئے ہیں ۔

اس میں سب سے پہلے ڈاکٹر اسد فیض نے ڈاکٹر مہر عبدالحق کے سرائیکی ترجمہ کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے اقبال کی فارسی تصنیف'' جاوید نامہ'' کا کیا ہے۔ یہ منظوم سرائیکی ترجمہ ہے اور جاوید نامہ اقبال'' کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ کتاب کے دیباچہ میں''جاوید نامہ'' کا ترجمہ کرنے کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر مہر عبدالحق لکھتے ہیں :

> '' اسلوبِ بیان کے لحاظ سے 'جاوید نامہ' فارسی کی نہایت بلند پایہ نظموں میں شمار ہوتی ہے ۔ الفاظ کا موزوں ترین انتخاب اور برمحل دلکش منظر نگاری ، مختصر مگر جامع طرز ادا اور ڈرامائی تاثر آفرینی کے اعتبار سے یہ نظم کسی بھی دوسرے بلند پایہ ادب پارے سے کم نہیں ۔'' (۳۰)

ڈاکٹر مہر عبدالحق کے ترجمہ کی جہاں اور بہت سی خوبیاں ہیں وہاں ایک خوبی کو ڈکٹر اسد فیض نے بہت عمدگی سے نشان زد کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

''ترجمہ کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ نظموں کے اوزان اور بحور بھی برقرار ہیں ، جو علامہ اقبال نے استعمال کیے ہیں اور اصل متن کی روح کو بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔'' (۳۱)

ڈاکٹر اسد فیض نے ایک ماہنامہ جریدہ '' سرائیکی ادب'' کا بھی ذکر کیا ہے جس کا بنیادی کام تو سرائیکی زبان و ادب کا فروغ تھا مگر اس میں اقبال کے شعری تراجم اور اقبال پر تنقیدی مضامین بھی شائع ہوتے رہے ۔ جن کی تفصیل ڈاکٹر اسد فیض نے باقاعدہ درج کی ہے جو ہمارے لیے اشاریے کا کام دے سکتی ہے۔

ڈاکٹر اسلم انصاری نے علامہ اقبال کے خطبات کا سرائیکی زبان میں ترجمہ کر رکھا ہے جو بقول ڈاکٹر اسد فیض ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ اس ترجمہ کے دیگر اوصاف میں ایک اہم وصف یہ ہے کہ'' اسلم انصاری نے خطبات کا سرائیکی ترجمہ کرتے وقت سرائیکی زبان میں نئی فلسفیانہ اصطلاحات بھی وضع کی ہیں۔''(۳۲)

اس کے علاوہ پنجابی زبان میں عبد المجید ساجد کی '' اقبال دی حیاتی '' اور'' دلاں دا چانن''اہم کتابیں ہیں ۔ پھر ماہوار جریدہ ''وارث شاہ'' کا اقبال نمبر بڑی اہمیت کا حامل ہے جو پنجابی زبان میں اقبالیات کا ''ملتانی اعتراف'' کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر اسد فیض نے بلا شبہ ان سب کی خدمات کو کھلے دل سے تسلیم کیا ہے۔

تیسرے باب میں ڈاکٹر اسد فیض نے الگ سے ملتان میں اقبال پر کام کرنے والے ناقدین کے تصورات اور خیالات کا نہ صرف جائزہ لیا ہے بلکہ تجزیہ سے بھی کام لیا ہے ۔ اگرچہ یہاں تکرار آ گئی ہے کہ دوسرے باب میں شعری اور نثری تخلیقات اور کتب کی تفصیلات درج کی گئی تھیں اور جب یہاں ناقدینِ اقبال پر الگ الگ بحث شامل کی گئی تو بہت سی کتابوں پر مکرر گفتگو کرنا پڑی۔ خیر تکرار کے باوجود فائدہ یہ ہوا ہے کہ الگ الگ نقاد کے نظریات سے آگاہی ہوئی ہے اور اقبال کے بارے میں مختلف اذہان کے غور وفکر کی رفتار کا اندازہ ہوا ہے ۔

اسد ملتانی کو ڈاکٹر اسد فیض اقبالیات کا پہلا نقاد بتاتے ہیں ۔ اُن کا کہنا ہے کہ'' اقبال ، انا اور تخلیق'' اسد ملتانی کا لکھا ہوا مضمون، اقبال پر لکھا جانے والا ملتان میں پہلا مضمون ہے ۔ یہ مضمون '' جولائی

۱۹۴۵ء کو'' معارف ، اعظم گڑھ'' سے شائع ہوا ۔ (۳۳) ڈاکٹر اسد فیض نے اس مضمون کا تفصیلی تجزیہ کرنے کے بعد جو نتیجہ پیش کیا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ لکھتے ہیں :

'' اسد ملتانی نے گہرے فنی شعور و علمی بصیرت کے ساتھ ان اشعار کے مفاہیم بیان کیے ہیں جن سے نہ صرف ان اشعار کی اہمیت و افادیت واضح ہو جاتی ہے بلکہ اسد ملتانی کی اقبالیات میں گہری دسترس اور دلچسپی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اُن کا اسلوب سادہ اور عام فہم ہے۔''(۳۴)

دوسرے اہم ناقد منشی عبد الرحمٰن ہیں جن کی ایک کتاب '' اقبال اور مسٹر'' کا ذکر پچھلے اوراق میں آ چکا ہے۔ انہوں نے ایک اور کتاب '' علامہ اقبال کی کردار کشی '' کے عنوان سے بھی لکھی تھی ۔ اس کتاب میں انہوں نے علامہ اقبال کے بارے میں معاندانہ نظریات کی حامل تحریروں اور کوششوں کی نشان دہی کی اور اپنے دعویٰ کی حمایت میں چند اقبال دوست شخصیات کے مضامین بھی اس کتاب میں شامل کر لیے۔ یہاں وہ اقبال کی حمایت میں جو موقف اختیار کرتے ہیں ، وہ یہ ہے ، لکھتے ہیں :

'' علامہ اقبال قدرت کا ایک ایسا عطیہ تھے جو اکثر و بیشتر ایسے وقت میں ملتا ہے جب کسی قوم کے قوی اعضاء مضمحل اور مفلوج ہو جاتے ہیں۔۔۔ اس لیے علامہ اقبال کو شروع سے فکر رسا عطا ہوئی تھی ۔۔۔ آپ کی فکر و نظر میں کوئی افراط و تفریط نہ تھی۔''(۳۵)

اصل میں منشی عبدالرحمٰن اس کتاب میں اس تاسف کا اظہار کرتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد قوم افکارِ اقبال کی اتباع میں گامزن نہ رہی اور زوال اور ذلت سے دوچار ہوئی ۔ ڈاکٹر اسد فیض نے منشی عبدالرحمٰن کی دونوں کتابوں کا بھر پور مطالعہ کرنے اور تجزیاتی انداز سے سوچتے ہوئے اقبالیات کے ذیل میں اُن کے کام کو اُن الفاظ میں بیان کیا ہے ، لکھتے ہیں :

> ''منشی عبدالرحمٰن کی دونوں کاوشوں ، اقبال اور مسٹر ، اور 'علامہ اقبال کی کردارکشی' اقبالیات میں ایک دفاعی حصار کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ انہوں نے استناد و استشہاد کے ساتھ مخالفین کے الزامات کو رفع کیا ہے اورعلامہ اقبال کے مکا تب اور تحریروں سے موثر انداز میں معاندانہ تحریروں کا جواب تحریر کیا ہے۔'' (۳۶)

ڈاکٹر اسد فیض نے اقبالیات کے ذیل میں جس تیسرے نقاد کا انتخاب کیا ہے ، وہ افتخار حسین شاہ ہیں ۔ اگرچہ انہوں نے اقبال پر بے شمار مضامین لکھے لیکن اُن کی کتاب '' اقبال اور پیروئ شبلی'' کافی مشہور ہوئی ۔ اگرچہ یہ اُن کے چودہ قابلِ قدر مضامین کا مجموعہ ہے مگر اس میں ان کا یہی مضمون '' اقبال اور پیروی شبلی'' زیادہ مشہور ہوا۔ اس میں افتخار حسین شاہ دلائل سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اقبال شبلی سے متاثر تھے اور فکرِ اقبال اصل میں شبلی کی ہی توسیع ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر اسد فیض کو اس سے کلی اتفاق نہیں ۔ اُن کا موقف یہ ہے کہ '' یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال شبلی کی فکری توسیع تھے البتہ اقبال شبلی کی ذہانتوں کے قائل اوراُن سے متاثر ضرور تھے ۔'' (۳۷)ہم بھی ڈاکٹر اسد فیض کے موقف سے اتفاق کرتے ہیں لیکن افتخار حسین شاہ اپنے مضمون '' اقبال اور پیروی شبلی'' کے آغاز میں لکھتے ہیں کہ :

> '' اگر میں مسئلہ حلول کا قائل ہوتا تو یہ اعلان کرتا کہ شبلی کی روح کا جسدِ اقبال میں حلول ہوا تھا یا یہ کہتا کہ اگر شبلی ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ کے قریب قصبہ بندول میں پیدا ہونے کی بجائے ۱۸۷۷ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوتے تو وہ اقبال ہوتے۔'' (۳۸)

اس کتاب کے علاوہ افتخار حسین شاہ نے اقبالیات کے دیگر موضوعات کو اپنے مضامین کا حصہ بنایا۔ مثلاً ایک مضمون '' علامہ اقبال، محقق اور نقاد کی حیثیت سے'' کے عنوان سے ہے جس میں اُن کی محققانہ اور ناقدانہ صلاحیتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر اسد فیض، افتخار حسین شاہ نے اس مضمون میں ایک نیا نقطۂ نظر پیش کیا ہے ،''اُن کا موقف ہے کہ علامہ اقبال کو شاعری ترک کر کے اقتصادیات اور دوسرے علوم کی

طرف توجہ دینی چاہیے تھی مگر یہ آرنلڈ کی سازش تھی کہ اُس نے علامہ اقبال کو دوبارہ شاعری کی طرف مائل کر دیا تاکہ وہ ان دقیق کاموں کی طرف توجہ نہ دے سکیں ۔''(۳۹) بہر حال دیکھنے کی بات یہ ہے کہ افتخار حسین شاہ نے اقبال کے حوالے سے فکر ونظر کے کئی دروا کیے۔ اور بلا شبہ اُن کے مضامین مطالعہ کی وسعت ،فکر کی گہرائی اور ندرت کی گواہی دیتے ہیں ۔

جابر علی سید بھی ملتان کے ایک معروف نقاد ہیں ۔جن کی ناقدانہ صلاحیتوں کے ادبی حلقے قائل ہیں۔ انہوں نے کل تنقید کی چھ کتابیں لکھیں ۔ جن میں سے دو کتابیں علامہ اقبال کے فکر وفن سے متعلق ہیں ۔ پہلی کتاب'' اقبال کا فنی ارتقا'' اور دوسری'' اقبال ۔ ایک مطالعہ''۔ اُن کی تنقید سے متعلق معروف محقق ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے ، وہ لکھتے ہیں :

> '' وہ (جابر علی سید) اُن نقادوں میں سے تھے جن کا تنقیدی سرمایہ بہ قامت کہتر مگر رطب ویاس سے پاک ہے اور ایک توازن ، وقار اور ٹھہراؤ کی کیفیت لیے ہوئے ہے۔''(۴۰)

جابر علی سید کو لفظ کی ماہیت اور عروض سے خصوصی دلچسپی تھی ۔ اسی لیے انہوں نے اپنی کتاب'' اقبال کا فنی ارتقا'' میں نہ صرف یہ کہ سائنس ، فلسفہ اور نفسیات کے تناظر میں لفظ اور معنی کے حوالے سے کلامِ اقبال میں ان مقامات کی نشان دہی کی ہے جہاں علامہ اقبال نے اسے خوب صورتی سے برتا ہے اور اپنی شاعری میں حسن اور نئے معنی پیدا کیے ہیں بلکہ اقبال کی شاعری میں موجود علامات و استعارات کا تنقیدی جائزہ لینے کے علاوہ جابر علی سید نے'' زبورِ عجم'' میں'' نالہ طور'' کی رباعیات کو عروضی طور پر رباعیات نہیں بلکہ قطعات قرار دیا ہے۔ یہ بڑی اہم بات تھی لیکن اس سلسلے میں وہ جو موقف اختیار کرتے ہیں آیئے خود ہی دیکھ لیتے ہیں ، وہ بڑے وثوق سے کہتے ہیں :

> اقبال نے جو استثناء، قطعہ اور رباعی کے فرق کے سلسلے میں اختیار کیا ہے، اس کی وجہ رباعیات بابا طاہر ہیں ، جن میں سے صرف پہلی دو رباعیات ہیں اور بقیہ سب مندرجہ ذیل وزن میں ہیں ۔ مفاعلین ،

مفاعلین فعولن ، لیکن یہ وزن رباعی کے دائرے سے خارج ہے ۔ اس
میں صرف تین رکن آ رہے ہیں ۔ رباعیات بابا طاہر کے اولین مرتب کا
نام معلوم نہیں ہو سکا ۔ اس کی غلط فہمی نے قطعے اور رباعی کے لازمی فرق
کو نظر انداز کر دیا ۔'' (۴۱)

ڈاکٹر اسد فیض نے جابر علی سید کی اقبالیاتی تنقید کی بنیاد پر یہ جانا ہے کہ جابر علی سید ، اقبال کی نظم ''مسجدِ قرطبہ'' کو اقبال کے فنی ارتقا کا نقطہ معراج سمجھتے ہیں اور اس کی وجہ اس نظم کی ترکیب بندی ، آہنگ ، وسعت اور تعمیر سب غیر فانی عناصر ہیں جو یک جا ہو کر ایک بڑے فن پارے کی تخلیق میں برابر کے شریک ہو گئے ہیں ۔

جابر علی سید کی دوسری کتاب '' اقبال ۔ ایک مطالعہ'' کا سب سے اہم مضمون '' اقبال اور فطرت'' ہے جو انتہائی فکر انگیز اور طویل مضمون ہے ، جس میں انہوں نے کلامِ اقبال میں علامہ اقبال کے فطرت سے تعلق اور اُس کے بیان کو موضوع بنایا ہے اور خاص طور پر اُردو اور انگریزی شاعری کی روایت میں اُسی کو جانچا ہے ۔ یہاں جابر علی سید نے ایک نہایت پتے کی بات کہی ہے ۔ لکھتے ہیں :

'' بال جبریل' کو 'بانگ درا' سے برتر مجموعہ شعری تسلیم کیا جاتا ہے یہ
مجموعی طور پر درست ہے۔ لیکن 'بانگ درا' کی ایک عظمت جس کا تعلق
فطرت نگاری سے ہے، وہ' بال جبریل' میں دب کر رہ گئی ہے۔''(۴۲)

جابر علی سید کی ان دونوں کتابوں کے مطالعہ سے جو ایک خاص خصوصیت سامنے آتی ہے وہ یہ کہ انہوں نے اپنی کتب میں مشرقی اور مغربی تنقیدی شعور کو یکساں طور پر پیشِ نظر رکھتے ہوئے تقابلی انداز میں فکرِ اقبال کا تجزیہ و تشریح کی ہے اور بقول ڈاکٹر اسد فیض ''جابر علی سید نے زیادہ تر ہئیت اور متن کے حوالے سے تنقید کی ہے اس لیے اُن کی تنقید ہئیتی تنقید کے زمرے میں آتی ہے ۔'' (۴۳) ڈاکٹر اسد فیض کا یہ تجزیہ بالکل درست ہے ۔

اگلے نقاد ، جن کا ذکر کرنا ڈاکٹر اسد فیض نے ضروری جانا ہے ، وہ اسلم انصاری ہیں ۔ اسلم انصاری،

اقبال کے مدّاح بھی ہیں اور اسلامی تاریخ کا گہرا علم اور شعور بھی رکھتے ہیں جو اقبال کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے ۔ اسلم انصاری کے مضامین ، اقبال اور دیگر علوم کے وسیع مطالعہ کا ثبوت ہیں۔

ڈاکٹر اسد فیض نے یہاں اپنے مقالہ میں اسلم انصاری کی اقبال پر لکھی گئی ایک ہی کتاب'' اقبال ۔ عہد آفریں'' کو موضوع بنایا ہے۔ ہوسکتا ہے اس مقالہ کی ترتیب و تنظیم تک اسلم انصاری کی یہی ایک کتاب شائع ہوئی ہو کیوں کہ ان کی اقبال پر ایک اور کتاب ''شعر و فکرِ اقبال''(۴۴) بھی بہت اہم ہے جس کا ذکر یہاں نہیں ہو سکا۔

''اقبال۔ عہد آفریں'' ڈاکٹر اسلم انصاری کی اقبالیات کے ذیل میں واقعی ایک اہم کتاب شمار کی جاتی ہے جس میں اقبال کے حوالے سے موضوعات میں نہ صرف تنوع ہے بلکہ وہ منطقی اعتبار سے کتاب کے عنوان کو درست بھی ثابت کرتی ہے ۔ اسلم انصاری چوں کہ خود بھی شاعر ہیں اور نظم بھی اعلیٰ پایے کی لکھتے ہیں ، لہٰذا انہوں نے اقبال کی نظم کا یہاں بڑے منفرد انداز میں تجزیہ کیا ہے ۔ اُن کے خیال میں :

> '' نظم جو اقبال سے پیشتر ایک حرف سادہ تھی ، اقبال کے جوہرِ تخلیق کی بدولت ایک ایسا نغمہ بن گئی ، جس میں حیات و کائنات کی کئی صداقتوں کو سمو دیا گیا تھا ۔ اقبال نے نظم کو خطِ مستقیم کا مسافر ہونے کے بجائے نغماتی تحرک اور آہنگ کے خم و پیش سے آشنا کیا اور نظم کو ایک پیچ کی طرح نقطۂ آغاز کے پھلنا ور پھولنا سکھایا، اُردو نظم پہلی بار اقبال ہی کے ہاں ایک نامیاتی وحدت کے طور پر رونما ہو ئی ۔ جس میں تعمیراتی وحدت کا حسن بھی موجود ہے ۔'' (۴۵)

اس کتاب کے دیگر مضامین '' اقبال کی بیانیہ شاعری''، اقبال اور عشقِ رسولؐ ،'اقبال کا تصورِ تاریخ '' ہیں ۔ یا ''اقبال کا لفظی تخیل'' اور'' اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عناصر'' جیسے مضامین میں اسلم انصاری نے ان عنوانات کی نئی معنویت کو اجاگر کیا ہے ۔ مثلاً 'اقبال کے لفظی تخیل' میں بقول ڈاکٹر اسد فیض: اسلم انصاری نے '' اقبال کے کلام کی روشنی میں اُن کی لسانی اختراعات پر بحث کی ہے اور ایسی علامات و استعارات کو نمایاں کیا ہے جو کلامِ اقبال میں نادر اور انفرادیت کے حامل ہیں'' ۔(۴۶)

مجموعی طور پر اگر ہم غور کریں تو اسلم انصاری کے ان مضامین میں علامہ اقبال ایک ایسی علمی وفکری تحریک کے طور پر ابھرتے ہیں جو مسلمانوں کے لا زوال ماضی کو اپنے اندر سموئے ہوئے ایک نئے مستقبل کی نوید دیتی ہے۔ جس میں عصرِ حاضر کے مسلمانوں کے ذہنی وفکری اور سیاسی مسائل کا حل موجود ہے ۔ ڈاکٹر اسد فیض کا ان مضامین کے بارے میں تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ :

> '' ان مقالات مین اسلم انصاری کا اسلوب علمی ،تحقیقی اور شاعرانہ دل کشی کا حامل ہے ۔ انہوں نے خالص علمی و فلسفیانہ بنیادوں پر ان موضوعات کی تعبیر وتفہیم کی ہے اور کلامِ اقبال کی ہیئت اور اسلوب کے علاوہ فکرِ اقبال کی نئی معنویت دریافت کرنے کی سعی کی ہے۔''(۴۷)

عاصی کرنالی جو ملتان کے مشہور شاعر ہیں ، انہوں نے بھی اقبال پر متعدد مضامین قلم بند کیے ۔ مثلاً ''اقبال اور آدم اور آدم نو کی تلاش'' اُن کا ایک اہم مضمون ہے جس میں انہوں نے قرآن میں انسان کے تصور اور اقبال کی شاعری میں تصورِ انسان کا موازنہ کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ انسان کامل کے تصور کا جائزہ بھی لیا ہے ۔ اس مضمون کا ایک اہم پیراگراف ملاحظہ کیجیے:

> ''حضرت محمدؐ انسانِ کامل ہیں۔ وہ کمال کے اس انتہائی مقام پر فائز ہیں، جس سے زیادہ کمال ممکن نہیں ۔ خدا اب ویسا انسان پیدا نہیں کرے گا۔ یہاں تکرار کا سوال ہی نہیں۔ اب اقبال کو کس آدم نو کا انتظار ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جو اس انسانِ کامل کی سیرت عظیم کا پرتو قبول کرے گا۔''(۴۸)

عاصی کرنالی کا ایک اور مقالہ '' اقبال کا تصورِ ثقافت'' ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ اقبال کا تصورِ ثقافت ،مسلم ثقافت کا دوسرا نام ہے اور مسلم ثقافت کی اساس عقیدہ توحید و رسالت پر ہے ۔ اسی طرح اپنے مقالہ '' اقبال اور عصرِ جدید'' میں عصرِ حاضر کی ادبی و ثقافتی اور سیاسی تحریکوں کا جائزہ لیا ہے اور اقبال

کے فکر و فلسفہ کو ان تحریکوں کے تناظر میں دیکھا ہے۔'' اقبا ل اور نوجوان'' کے عنوان سے علامہ اقبال کی شاعری میں نسلِ نو کے لیے پیغام کو عیاں کیا گیا ہے ۔

اپنے ایک مضمون '' اقبال کا تصورِ جنت'' میں پروفیسر عاصی کرنالی نے ایک نیا انداز اپنایا ہے، وہ تصورِ اقبال کو اپنے دامِ خیال میں لا کر ان کے جنت کے بارے میں تصورات کو ان کے کلام کے حوالے سے بیان کرتے ہیں ۔

ایک اور مضمون '' اقبال کی برکتیں'' اس حوالے سے بہت دلچسپ ہے کہ اس میں عاصی کرنالی نے ان حضرات کے بارے میں گہرا طنز کیا ہے جو اقبال کے نام سے محبت کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن فکرِ اقبال سے انہیں کوئی سروکار نہیں اور وہ اسے صرف کاروبار بنائے بیٹھے ہیں ۔ ڈاکٹر اسد فیض: عاصی کرنالی کے ایسے ہی مضامین کی بنیاد پر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ :

> ''عاصی کرنالی : علامہ اقبال کے اشعار کی مدد سے تجزیاتی انداز اپناتے ہوئے علامہ اقبال کے افکار کو اپنے مضامین کا موضوع بناتے ہیں ۔ ان کے مضامین کا ایک خاص پہلو اقبالیات کے وہ موضوعات ہیں جن کا عملی زندگی میں اطلاق بھی ہوتا ہے اس طرح وہ فلسفہ ٔ اقبال کو براہِ راست زندگی سے منطبق کرتے ہیں تا کہ آج کا انسان ان سے استفادہ کر سکے۔'' (۴۹)

ڈاکٹر اے بی اشرف؛ ملتان کے چند اہم بڑے ناقدین میں سے ایک ہیں ، ان کی ناقدانہ تحریریں اعتبار حاصل کر چکی ہیں ۔'' بحیثیتِ نقاد ڈاکٹر اے بی اشرف ادب کے فنی پہلو کو بڑ ی اہمیت دیتے ہیں اور ضروری خیال کرتے ہیں کہ ادب کو کلچر اور تہذیب کی ترقی میں مدد دینی چاہیے۔'' (۵۰)اگرچہ ڈاکٹر اے بی اشرف بنیادی طور ر پر ڈرامہ اور افسانہ کی تنقید سے منسلک ہیں لیکن انہوں نے اقبالیات کے ذیل میں بھی کافی مضامین لکھے اور پھر اُن کی تقابلی تنقید کی حامل دو کتابیں'' میر ، غالب اور اقبال'' اور'' غالب اور اقبال'' شائع ہوئیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہے کہ اُن کا اقبال کا مطالعہ زیادہ تر تقابلی رجحان کا حامل ہے ۔ یہ تقابل کہاں تک کامیاب رہا یہ ایک بحث طلب بات ہے کیوں کہ اُن کے اس طرح کے بیانات کو آسانی سے

قبول کرنا ایک مشکل امر ہے ۔ اپنی کتاب'' غالب اور اقبال'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میرے مطالعے کا مرکزی نقطہ یہی ثابت کرنا تھا کہ دونوں شاعروں کا شعری تناظر، تخلیقی ہدف ، موضوعات و مضامین اور نقطہ ہائے نظر مختلف اور متبائن تھے ، اپنے آدرش اور ہدف مقاصد کے اعتبار سے اقبال غالب سے آگے تھے ۔'' (۵۱)

اس سے انکار نہیں کہ علامہ اقبال کی شاعری کسی بھی دور میں حریتِ فکر اور جدوجہدِ آزادی کے حوالے سے دنیا بھر کی اقوام کے لیے منشور کی حیثیت رکھتی ہے مگر پھر بھی یہ معاملہ بحث طلب رہے گا کہ وہ غالبؔ سے آگے ہیں یا نہیں ۔

'' فلسفہ اقبال اور اس کے ماخذ'' ڈاکٹر اے بی اشرف کی اس کتاب کا ایک اور بہت وقیع مضمون ہے جس میں انہوں نے تاریخی حالات و واقعات کے تناظر میں علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کے نقوش کو تلاش کیا ہے ۔ اس کے علاوہ جن مضامین کو ڈاکٹر اے بی اشرف کے اہم مضامین کہا جا سکتا ہے اُن میں'' افکارِ اقبال پر فلسفۂ اسلام کے اثرات''،'' اقبال اور معاشرتی اقدار''،'' اقبال اور قائداعظم''، اور'' اقبال کا نظریۂ تعلیم'' نہایت اہم ہیں ۔ انہی مضامین کے مطالعہ کے بعد ڈاکٹر اسد فیض یہ کہتے ہیں کہ :

'' ڈاکٹر اے بی اشرف کا اسلوب نہایت واضح اور سادہ ہے اور استدلال کے ساتھ منطقی انداز میں کسی تخلیق کا تجزیہ کرتے ہیں لیکن ان کی تنقید میں ان کے ترقی پسندانہ نظریات کی جھلک بھی صاف نظر آتی ہے ۔''(۵۲)

ڈاکٹر انوار احمد کا نام بھی ملتان کے محققین اور ناقدین میں انتہائی احترام سے لیا جاتا ہے ۔ اُن کا بنیادی میدان بھی افسانہ ہے مگر انہوں نے بھی اقبال پر کم مگر انتہائی اہم تحریریں قلم بند کی ہیں ۔ دو اہم مضامین اور ایک کتاب'' تحریکِ پاکستان میں علامہ اقبال کا کردار'' کے عنوان سے لکھی ۔ اس میں شک نہیں

کہ ڈاکٹر انوار احمد کی تنقید معاشرے میں طبقاتی کشمکش اور اس سے جنم لینے والے حالات و واقعات سے عبارت ہے اور بقول ڈاکٹر اسد فیض :

'' وہ ادب کے مقصدی ہونے کے قائل ہیں اور اُن کے خیال میں اس مقصد کی نوعیت سماجی ہونی چاہیے۔ اقبالیات میں بھی اُن کی تحریروں میں یہی نقطہ نظر حاوی نظر آتا ہے۔''(۵۳)

تحریکِ پاکستان کے حوالے سے علامہ اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا تھا لیکن ڈاکٹر انوار احمد کی مذکورہ بالا کتاب اس لحاظ سے منفرد حیثیت کی حامل قرار پائی کہ اس میں معروضی انداز میں تحریکِ پاکستان میں علامہ اقبال کے سیاسی کردار کو حقیقت اور واقعیت کے آئینہ میں اجاگر کیا گیا ہے ۔ بلاشبہ ڈاکٹر انوار حمد نے اس موضوع پر مستند کتب سے استفادہ کرتے ہوئے اس موضوع پر تمام اہم مواد کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔

خطبہ الہ آباد کا تجزیہ ، اس کتاب کا ایک اہم پہلو ہے کہ جس میں ڈاکٹر انوار احمد نے کچھ فکری سوالات اٹھائے ہیں ، جو اقبالیات میں نئے مباحث کا باعث ہوں گے ۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں کہ :

'' ا۔ برصغیر میں اقبال کی توجہ کا مرکز شمال مغرب کے مسلمان رہے ہیں۔ بنگالی مسلمانوں کی فکری اور سیاسی بیداری سے اقبال بہت زیادہ انسیت محسوس نہیں کرتے ہیں۔
۲۔مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد موجودہ پاکستان کا جغرافیائی نقشہ وہی ہے جو اقبال کی مجوزہ ریاست کا ہے ۔'' (۵۴)''

اسی طرح ڈاکٹر انوار احمد نے اپنے مضامین میں بھی فکری انگیخت کا پورا پورا سامان کیا ہے کہ جسے ملتان کے اقبالیاتی ادب میں شمار کیے بغیر چارہ نہیں ۔ اُن کا قلم تازہ کاری کی عمدہ مثال ہے اور فکری بیداری کی اقبال کی روایت کو آگے بڑھانے میں پیش پیش ہے ۔

ڈاکٹر نجیب جمال نے اگرچہ اقبا ل کے حوالے سے محض دو مضامین لکھے ہیں مگر ڈاکٹر اسد فیض نے

اُن کا ذکر بھی اسی ذیل میں کرنا ضروری خیال کیا ہے کیوں کہ اُن کے خیال میں ''ڈاکٹر نجیب جمال کی تنقید میں اقبال ایک غزل گو شاعر کے طور پر سامنے آتے ہیں ،جنھوں نے غزل کے دامن کو وسیع کیا ہے'' ۔(۵۵) اصل میں ڈاکٹر نجیب جمال نے اپنے مضمون '' میری غزل ہے میرا ثمر'' میں اُردو غزل کی روایت میں علامہ اقبال کی غزل کا مزاج تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔

اُن کا دوسرا مضمون '' مسجدِ قرطبہ ایک تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس میں ڈاکٹر نجیب جمال نے رومانوی اور حقیقت پسندانہ ہر دو طرح کے تنقیدی اسلوب کا اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی کے بارے میں ڈاکٹر اسد فیض نے بالکل بجا کہا ہے کہ'' اقبالیات میں ڈاکٹر طاہر تونسوی مرتب کے طور پر بلند مقام کے حامل ہیں ۔'' (۵۶) ڈاکٹر طاہر تونسوی نے علامہ اقبال کے فکر وفن اور اس سے متعلق موضوعات پر آٹھ کتب مرتب کی ہیں ۔

ایک کتاب میں انہوں نے عزیز احمد کے نایاب اور اہم مقالات کو یکجا کر دیا ہے جس سے عزیز احمد کی اقبال شناسی کے تمام پہلو واضح ہو کر سامنے آتے ہیں ۔ دوسری کتاب '' حیاتِ اقبال'' کے عنوان سے مرتب کی ۔ اس میں ڈاکٹر طاہر تونسوی نے مختلف اقبال دوست شخصیات کے ایسے مضامین اکٹھے کر دیے ہیں جن سے علامہ اقبال کی سوانحِ حیات ترتیب پا گئی ہے۔

اسی طرح ایک کتاب '' علامہ اقبال اور سید سلیماں ندوی'' کے عنوان سے ، ایک ''اقبال اور مشاہیر'' کے عنوان سے ہے۔ پھر مختلف رسائل میں چھپنے والے اقبال پر مضامین کے انتخاب پر مبنی تین کتابیں ۔غرض یہ کہ اچھا خاصا اقبالیاتی سرمایہ ، ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اپنی تحقیقی کاوشوں سے مرتب کر دیا ہے۔ اگر ہم ان کتابوں پر گہری نظر ڈالیں تو ہمیں ڈاکٹر طاہر تونسوی کے کام کی قدر کا اندازہ ہوتا ہے اور ہم ڈاکٹر اسد فیض کی اس رائے سے اتفاق نہ کرنے کی جرأت نہیں پاتے ۔ وہ کہتے ہیں:

> ''اقبالیات پر ڈاکٹر طاہر تونسوی کی مرتب کی گئی تمام کتب کی ترتیب و تدوین میں تحقیق و تلاش کا عنصر بھی شامل ہے اور یہ ان کے تنقیدی شعور کی آئینہ دار ہیں ۔ کتابوں میں کتابیات ، اشاریہ اور حوالوں کا اہتمام اُن کی اہمیت و افادیت میں اضافہ کرتا ہے ۔ اسی سبب سے انہیں (ڈاکٹر طاہر تونسوی) اقبال شناسی اور تفہیم کے فروغ کے حوالے قابلِ ستائش

قرار دیا جا سکتا ہے ۔''(۵۷)

عبدالمجید ساجد کی دو پنجابی زبان کی کتابوں کا ذکر پچھلے اوراق میں آ گیا تھا۔ اُردو میں اُن کی کتاب '' اقبال: حیاتِ عصر'' اس حوالے سے اہم قرار پاتی ہے کہ یہ نہ صرف علامہ اقبال کی مبسوط سوانح حیات ہے بلکہ اس میں انہوں نے اقبال کی تاریخِ ولادت ۱۸۷۳ء سے اتفاق کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'' تعلیمی ریکارڈ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کی عمریں اندازاً لکھوائی جاتی رہیں اور اس کا کوئی التزام نہ رکھا گیا ۔ اسی طرح داخلے کے وقت بھی عمر تخمینا لکھوائی گئی اور جو عمر دینی مدرسوں میں صرف کی وہ عمر کے کھاتے سے نکال دی گئی ۔ہمیں سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے ریکارڈ پر اعتماد کرنا چاہیئے اور اس بات کو یقینی مان لین اچاہیئے کہ اقبا ل کی تاریخِ ولادت ۲۱ دسمبر ۱۸۷۳ء ہے۔'' (۵۸)

اس کتاب میں علامہ اقبال کے احباب پر تفصیلی مواد فراہم کرنے کے علاوہ فکرِ اقبال کا مشرقی اور مغربی مفکریں کے نظریات سے موازنہ بھی کیا ہے اور فکرِ اقبال کی برتری اور محاسن کو ثابت کیا ہے۔ کتاب کی ایک اور خوبی حیات و افکارِ اقبال پر لکھی گئی متعدد کتابوں کے موضوعات وعنوانات کے بارے میں اپنا موقف بیان کیا ہے اور نہایت موثر انداز میں استدلال کے ساتھ اقبالیات کا دفاع بھی کیا ہے ۔

عبدالمجید ساجد کی دوسری کتاب'' عقیدہ اقبال'' جو ڈاکٹر اسد فیض کے اس مقالہ کے تحریر کے وقت زیرِ طبع تھی ، کے بارے میں ڈاکٹر اسد فیض ہمیں بتاتے ہیں کہ

'' یہ کتاب شیخ اعجازاحمد کی کتاب ' مظلوم اقبال' کا مدلل جواب ہے۔ اس کتاب میں قادیانی مذہب اور علامہ اقبال کے قادیانیوں سے تعلق کے بارے میں تمام حالات و واقعات کو تحقیقی حوالوں کے ساتھ موضوع بنایا گیا ہے۔'' (۵۹)

ڈاکٹر ایس ایم منہاج الدین؛ ملتان کے ایک اور اہم ادیب اور نقاد ہیں ۔ علامہ اقبال پر انہوں نے قابلِ ذکر کتب تصنیف کی ہیں ۔ پہلی کتاب '' افکارو تصوراتِ اقبال'' ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی ۔ دوسری کتاب ''تصوراتِ اقبال'' ہے جو ۱۹۸۹ء میں منظرِ عام پر آئی اور تیسری کتاب بھی اسی برس '' افکارِ اقبال'' کے عنوان سے شائع ہوئی ۔ اقبالیات کے ذیل میں اُن کے تحقیقی و تنقیدی کام کا مقصد اُن کی پہلی تصنیف کے دیباچہ سے ظاہر ہو جاتا ہے، جہاں وہ یہ لکھتے ہیں کہ :

> '' اقبال کے افکار و تصورات سے متعلق لکھی گئی بہت سی کتابیں میری نظر سے گزریں اور اکثر میں نے محسوس کیا کہ اقبال کے ناقد کبھی محبت میں اور کبھی عداوت میں حد سے تجاوز کر گئے ہیں اور جو کچھ آپ نے نہیں کہا ہے وہ بھی آپ سے منسوب کر کے لکھ گئے ہیں ۔ میں نے اقبال کے افکار و تصورات کو سیدھے سادے ، عام فہم اور مثبت انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔'' (۶۰)

یہ درست ہے کہ انہوں نے اپنی اس کتاب میں فکرِ اقبال کو عام فہم اور تفریحی انداز میں پیش کیا ہے، اس کے علاوہ کتاب کی ایک اور خصوصیت حواشی اور حوالوں کا اہتمام ہے، جس سے تحقیقی اہمیت میں کافی اضافہ ہوا ہے ۔ اس لیے یہ طالبِ علموں کے لیے ایک مفید کتاب بن گئی ہے۔

اس کتاب کا مقالہ '' اقبال کا نظریۂ اجتہاد'' بقول ڈاکٹر اسد فیض کے اس کتاب کا '' ایک طویل اور معانی آفریں مقالہ ہے جو حقیقی طور پر اسلام میں اجتہاد کی اہمیت اور مختلف اسلامی ادوار میں اس کی افادیت و کردار سے بھی بحث کرتا ہے ۔'' (۶۱) اور اجتہاد کے مسئلہ کا تاریخی پس منظر میں جائزہ لیتا ہے ۔

تیسری کتاب '' افکارِ اقبال'' میں ڈاکٹر ایس ایم منہاج الدین نے اقبال کی چند مختصر اور طویل نظموں کے تجزیے پیش کیے ہیں ۔جن کے بارے میں اسد فیض کا کہنا ہے کہ '' کتاب میں دی گئی نظموں کا تجزیہ بے حد مختصر ہے اور نظموں کے بعض فنی و فکری پہلو بھی تشنہ رہ گئے ہیں ۔'' (۶۲) اصل میں ڈاکٹر ایس ایم منہاج الدین کا مقصد تفصیلی تجزیے پیش کرنا تھا ہی نہیں ۔ انہوں نے یہ کتاب بھی طلبا کو سامنے رکھ کر اُن کی

ضروریات کے مطابق لکھی تھی ۔ اس لیے وہ صاف صاف لکھتے ہیں کہ:

’’میں نے اس کتاب میں اقبال کی نمائندہ چند طویل اور مختصر نظموں کا سیدھی سادی زبان اور مربوط انداز میں فکری اور فنی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے ، یہ جائزہ فکری زیادہ اور فنی کم ۔ میرا یہ انداز ارادی ہے ، میں اقبال کے افکار عام قارئین اور خصوصیت کے ساتھ نوجوان طلبا و طالبات تک پہنچانا چاہتا ہوں ؛‘‘(۶۳)

اسی لیے ہمیں ڈاکٹر اسد فیض کا یہ برمحل تبصرہ بہت متاثر کرتا ہے ۔ وہ بڑے صاف الفاظ میں لکھتے ہیں کہ ’ ’ڈاکٹر ایس ایم منہاج الدین کی تینوں کتابیں کسی خاص تنقیدی زاویہ منظر کی حامل نہیں البتہ یہ اپنے اسلوب اور فنی نقطہ نگاہ سے تاثراتی تنقید کے زمرے میں آتی ہیں۔‘‘(۶۴) بہر حال اس کے باوجود فکرِ اقبال کے فروغ اور تفہیم کے حوالے سے انہیں ملتان کے اقبالیاتی ادب میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

پروفیسر حمید رضا صدیقی ایسے محقق ہین جن کے بنیادی موضوعات اقبال اور پاکستان ہیں ۔ اقبال پر اُن کے متعدد مقالات اخبارات و رسائل میں چھپ چکے ہیں ۔ اُن کی تنقید ،تحقیق کا پس منظر لیے ہوئے ہے اور انہوں نے خاص طور پر علامہ اقبال کی زندگی اور سیاسی افکار کو اپنے مضامین کا موضوع بنایا ہے۔ بقول ڈاکٹر اسد فیض:

’’ علامہ اقبا ل کو عام طور پر ایک شاعر کے طور پر ہی نمایاں کیا گیا ہے حالاں کہ وہ اعلیٰ درجہ کی سیاسی بصیرت اور شعور بھی رکھتے تھے۔‘‘(۶۵)

اسی لیے پروفیسر حمید رضا صدیقی نے زیادہ توجہ اقبال کے سیاسی افکار و نظریات کو سمجھنے اور سمجھانے کی طرف رکھی ۔اور’’اقبال بحیثیت سیاست دان‘‘،’’ اقبال اورعلم الاقتصاد‘‘،’’اقبال اور پنجاب اسمبلی کا الیکشن‘‘اور ’’ اقبال کا نظریہ قومیت‘‘ جیسے وقیع اور توجہ طلب مقالات قلم بند کیے کہ جن سے اقبال کی سیاسی نظر اور سیاسی افکار سے کما حقہ آ گاہی ملتی ہے۔ بلاشبہ پروفیسر حمید رضا صدیقی کے مضامین ان کی اقبالیات میں گہری دلچسپی

کے آئینہ دار ہیں ۔ اُنھوں نے تاریخی حقائق اور کلام اقبال کے فکری عناصر میں اقبال کی شخصیت کے اصل جوہر کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔

اسی طرح حفیظ الرحمٰن خاں کے اقبال پر لکھے گئے متعدد مضامین بھی ملتان میں اقبالیات کی روایت میں اہم مقام پر فائز ہیں ۔ اُن کے مضامین کے پیشِ نظر ڈاکٹر اسد فیض ان کی تنقید کا تجزیہ ان الفاظ میں کرتے ہیں ۔ لکھتے ہیں :

> '' علامہ اقبال کی شاعری اورفکر وفلسفہ مسلمانوں کے عظیم ملی اور تہذیبی ورثہ کا امین ہے، پروفیسر حفیظ الرحمٰن نے اقبال کی شاعری سے ان عناصر کا کھوج لگانے کی سعی کی ہے جن کی روشنی میں عصرِ حاضر کے مسائل سے نپٹا جا سکتا ہے ۔''(۶۶)

ڈاکٹر عبدالروَف شیخ کو ڈاکٹر اسد فیض نے اُن کی کتاب '' اقبال شناسی اور عابدؔ'' کے حوالے سے ناقدان اقبال میں شامل کیا ہے۔ لیکن یہ کتاب اقبالیات کے حوالے سے کوئی فکری تاثر قائم نہیں کرتی اس لیے ڈاکٹر اسد فیض نے ذکر تو ضرور کیا مگر اس کی خامیوں کی بنیاد پر زیادہ لائقِ توجہ نہیں سمجھا۔ یہ اُن کا درست تحقیقی وتنقیدی رویہ ہے اور اسی رویے کا اظہار انہوں نے اپنے اس مقالہ میں بیش تر جگہوں پر کیا ہے۔

اپنے اس تحقیقی مقالے کے چوتھے باب میں ڈاکٹر اسد فیض نے ملتان میں اقبالیاتی ادب کے فروغ میں اداروں کے کردار کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس ذیل میں خاص طور پر '' بزمِ اقبال''، مجلس اقبال'' ، ''ریڈیو پاکستان ملتان'' اور ''بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ، ملتان'' کے ساتھ ساتھ ''پاکستان نیشنل سینٹر ملتان''، ''مسلم ہائی اسکول ملتان''، '' فاران اکادمی ملتان''، '' مطبع شمس ملتان''، '' عالمی ادارہ اشاعت علوم اسلامیہ ملتان''، ''کاروان ادب ملتان''، بیکن بکس ملتان''، '' ادارہ تحقیق وادب''، اور '' ادارہ تحریک تحفظ ختم نبوۃ ملتان'' کی خدمات کو بیان کیا ہے ۔

ڈاکٹر اسد فیض نے ان اداروں کے قیام اور عمل پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے ۔ ان کے اس تحقیقی کام سے ملتان میں ہونے والے اقبالیاتی ادب کی رفتار کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے ۔ ریڈیو پاکستان ملتان میں ہونے والے اقبال کے حوالے سے جتنے پروگراموں کی تفصیل معلوم ہوسکی ، ڈاکٹر اسد فیض نے وہ ساری درج کر

دی۔ اس کے علاوہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتا ن میں ہونے والے سارے تحقیقی حوالے سے یہ بہت محنت طلب باب ہے۔مختلف اداروں میں جا کر تمام ریکارڈ ز کی چھان بین کرنا اور فہرستیں بنانا،عملی تحقیق کا انتہائی دقت طلب کام ہے ۔جس سے ڈاکٹر اسد فیض بہت عمدگی سے عہدہ برا ہوئے ہیں ۔ ریڈیو پاکستان ملتان کے حوالے سے لکھتے ہیں :

'' ریڈیو پاکستا ن ملتان نے علامہ اقبال کے فکر و فن اور کلام پر مبنی لاتعداد پروگرام پیش کیے ہیں جو اقبالیاتی ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں لیکن افسوس کہ ان تمام کا ریکارڈ ریڈیو پاکستان ملتان کے پاس محفوظ نہیں ۔'' (٦٧)

لہذٰا جو ریکارڈ دستیاب تھا اُس کی فہرست بنائی اورتفصیلاً بنائی اور وہ تمام کی تمام بڑی محنت سے پیش کر دی ۔غرض یہ کہ ڈاکٹر اسد فیض نے ملتان کے اداروں میں ہونے والے اقبالیاتی کام کو اس طرح بیان کر دیا ہے کہ اب یہ کام بذاتِ خود حوالے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے ۔

اس باب کا ایک حصہ اصل میں پورا اشاریہ ہے جس کی داد نہ دینا ڈاکٹر اسد فیض کے ساتھ یقیناً زیادتی ہو گی ۔ اس حصہ میں ڈاکٹر اسد فیض نے ملتان کی مختلف درسگاہوں سے شائع ہونے والے میگزین میں علامہ اقبال سے متعلق مندرجات کو درج کیا ہے اور پورا اشاریہ ترتیب پا گیا ہے ۔

''ملتان یونیورسٹی میگزین''،'' زلال''،'' الخیل''،''نخلستان''،''صناع ''،'' القاسم''،قنوان''،'' سفینہ ادب''،'' دلیل سحر''،'' شگرف''،'مسلک''،نشتر''،'سپیکٹرم''،'' گلِ صحرا''اور'' جوہر'' ان تمام میگزین میں اقبال کے حوالے سے شائع ہونے والی تحریروں کا سارا ریکارڈ درج کر دیا گیا ہے جو لوگ اشاریہ کی اہمیت کو سمجھتے ہیں وہ اس کام کی قدر دانی بھی کر سکتے ہیں اور اس کام میں صرف ہونے والی محنت کا اندازہ بھی لگا سکتے ہیں ۔ ادیب سہیل نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے درست لکھا ہے کہ ''ملتان کے تعلق سے اقبال پر یکجا مواد شاید اس سے پہلے کسی اور کتاب میں نہیں دیکھا گیا۔(٦٨) اور یہ ہی صحیح بات بھی ہے۔

'' ملتان میں اقبال شناسی کا مجموعی جائزہ'' کے عنوان سے ڈاکٹر اسد فیض نے اس تحقیقی مقالے کا آخری باب رقم کیا ہے ۔جس میں پچھلے ابواب کے نتائج کو اجمالاً تحریر کیا ہے اور اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ

ہو گا کہ دریا کو کوزے میں بند کیا ہے ۔ بڑی جامعیت اور اختصار کے ساتھ حاصلات کو سپر د قلم کیا گیا ہے ۔ بنیادی بات جو ڈاکٹر اسد فیض نے اپنے اس پورے کام کی اخذ کی وہ یہ ہے کہ :

'' اقبالیات میں چند ناقدین اور کتب کے علاوہ جو عمومی تنقید لکھی گئی ہے وہ تاثراتی تنقید ہے جو اب کلیے کا روپ دھار چکی ہے ۔ لیکن خطہء ملتان میں لکھی جانے والی اقبالیاتی تنقید تخلیقی تنقید کے زمرے میں آتی ہے ۔ جس میں تازگی اور نئی معنویت کا احساس ہو تا ہے۔ ملتان میں علامہ اقبال پر لکھی جانے والی کتب میں فکر ونظر کا تنوع اور اسلوب کی بوقلمونی نظر آتی ہے ۔'' (۶۹)

اگر چہ یہاں بحث کے بہت سے دریچے وا ہو سکتے ہیں مگر ہمارا کام یہ دیکھنا ہے کہ ڈاکٹر اسد فیض نے اپنی تحقیق سے کیا نتیجہ بر آمد کیا ؟ کوئی نتیجہ بر آمد بھی کیا یا نہیں ؟ تو ہم اس اقتباس کی بنیاد پر یہ دعوٰی کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر اسد فیض نے اپنے مقالے سے پورا پورا نتیجہ اخذ کیا ہے ۔

ڈاکٹر اسد فیض نے ''ملتان میں اقبال شناسی'' کے علاوہ اقبال کے حوالے سے چند اہم مضامین بھی لکھے جو ملک کے مختلف موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ۔ ان مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اسد فیض کی اقبال سے دلچسپی برابر رہی ہے ۔ وہ مختلف تحقیقی مضامین سپردِ قلم کر کے اقبالیات کے نادر گوشوں سے ادبی قارئین کے ذوق کی تسکین کرتے رہے ہیں ۔ اُن کے اقبال پر لکھے گئے مضامین درج ذیل ہیں :

۱۔ ملتان میں اقبال شناسی کی روایت
۲۔ ملتان میں اقبال کے ملاقاتی
۳۔ ملتان مین اقبالیاتی ادب کا جائزہ (۱۹۹۵ء تا ۱۹۹۹ء تک)
۴۔ علامہ اقبال ، منٹگمری اور خلیل احمد
۵۔ اقبال کے نثری کارنامے
۶۔ اصلاحِ معاشرہ اور علامہ اقبال

۷۔ اقبال کی شخصیت: خطوط کے آئینے میں

۸۔ مجلّہ ایسٹ اینڈ ویسٹ اور اقبال شناسی

۹۔ کریسنٹ کا ایک یادگار شمارہ

اپنے مضمون ’’ ملتان میں اقبال شناسی کی روایت‘‘ میں ڈاکٹر اسد فیض تحقیقی نقطۂ نظر سے اقبال پر ملتانی صوفیا کے اثرات ، اُن کی مماثلتیں ، اقبال کے ملتان کے شعرا پر اثرات اور ملتان میں ہونے والے اقبالیاتی ادب کا بہ یک وقت مطالعہ پیش کرتے ہیں ۔جس سے اس مضمون کی ہمہ گیریت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ خواجہ غلام فرید اور اقبال کی شاعرانہ مماثلت کے بارے میں ڈاکٹر اسد فیض لکھتے ہیں :

’’ان (خواجہ غلام فرید) کی شاعری میں ہجر و فراق اور اس کے کرب کی درد ناک فضا پائی جاتی ہے اور ان کے نزدیک فرد واحد کا روحانی کمال یہ نہیں کہ وہ اپنی ہستی کو ہستی مطلق میں ضم کر دے بلکہ وہ ذات کی انفرادیت اور اس کے عرفان کا درس دیتے ہیں چنانچہ خودی ، فراق اور عشق کے سلسلے میں اقبال اور خواجہ غلام فرید کے خیالات میں گہری مماثلت نظر آتی ہے ۔‘‘(۷۰)

ڈاکٹر اسد فیض کا یہ موقف بھی ہے کہ علامہ اقبال کے سب سے زیادہ اثرات خطۂ ملتان کے شعرا پر ہوئے ۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال کے، جیسے اثرات ملتان کے شعرا نے قبول کیے ہیں وہ کسی اور خطہ کے شعرا نے قبول نہیں کیے۔ ڈاکٹر اسد فیض کا بیان اس ضمن میں بڑا دو ٹوک ہے ، لکھتے ہیں :

’’ خطۂ ملتان میں لکھی جانے والی شاعری پر نظر دوڑائی جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ علامہ اقبال کی شاعری کے تمام اجزاء مرتسم طور پر یہاں کی شاعری میں رچے بسے نظر آتے ہیں اور یہ پہلو خطۂ ملتان

کی شاعری پر اتنا حاوی ہے کہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ علامہ اقبال کے بعد ٹھیٹھ دبستان اقبال خطہ ملتان میں پیدا ہوا۔ یہاں ایسے شعرا نے جنم لیا جنہوں نے خالصتاً اقبال کے رنگ میں شاعری کی۔''(۷۱)

مختلف ناقدین نے اقبالیات میں جو کام کیا اُن کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے اور جن اداروں نے اقبالیات کے فروغ میں کام کیا اُن پر بھی تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔ غرض یہ کہ چند صفحوں میں ملتان میں اقبال شناسی کی روایت کو بیان کردیا ہے ۔

'' ملتان میں اقبال کے ملاقاتی '' ڈاکٹر اسد فیض کا ایک اور مضمون ہے ، جس میں انہوں نے ملتان کے اُن بزرگ اور ادیبوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اپنے وقت میں اقبال سے وقتاً فوقتاً ملاقات کی اور فیض اٹھایا ۔

ان میں پہلی ادبی ہستی اسد ملتانی کی ہے ، دوسری ہستی سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ہے، جو برصغیر کی ایک دینی اور سیاسی شخصیت تھے۔ اُن کی شعلہ بیانی نے انگریزوں کی سامراجیت کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ڈاکٹر اسد فیض نے اقبال سے ملتان کے تیسرے ملاقاتی مولانا نور احمد فریدی کو بتایا ہے ، جو معروف ادیب تھے۔ چوتھے اور ڈاکٹر اسد فیض کے بیان کردہ آخری ادیب ، ڈکٹر مہر عبدالحق ہیں جن کو اقبال سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور اگرچہ انہوں نے اپنا احوال تحریری شکل میں بھی شائع کروایا مگر ڈاکٹر اسد فیض کو انہوں نے زبانی بھی پوری تفصیل سے آگاہ کیا۔ ڈاکٹر اسد فیض لکھتے ہیں :

''ملتان جو علم و ادب کا ایک قدیم اور اہم مرکز رہا ہے ۔ یہاں کے ادیبوں اور دانش وروں نے علم و ادب کی جستجو اور اقبال کی محبت و عقیدت میں مختلف اوقات میں ان سے ملاقاتیں کیں ۔'' (۷۲)

ایک اہم مقالہ ڈاکٹر اسد فیض کا ''ملتان میں اقبالیاتی ادب کا جائزہ''(۱۹۹۵ء سے ۱۹۹۹ء تک) ہے۔ اس میں ۱۹۹۵ء سے لے کر ۱۹۹۹ء تک کے اقبالیاتی ادب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے ۔ اس میں کچھ ایسی

کتابوں کا ذکر آیا ہے جو اُن کے مقالہ '' ملتان میں اقبال شناسی'' میں شامل ہونے سے رہ گئیں ۔ مثلاً ایک کتاب عبدالمجید ساجد کی '' ختم نبوۃ اور عقیدہ اقبال'' ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر اسد فیض کا کہنا ہے کہ :

'' یہ ایک اہم موضوع تھا جس پر کام کی اشد ضرورت تھی ۔ عبدالمجید ساجد نے نہایت عرق ریزی سے اقبال اور قادیانیت کے حوالے سے تمام مواد اور اس سلسلے میں جنم لینے والے سوالات کے جوابات تحریر کیے ہیں۔''(۷۳)

اس کے علاوہ ڈاکٹر اسلم انصاری کی '' فیضانِ اقبال'' اور '' شعر وفکرِ اقبال'' کا خصوصی تذکرہ کیا گیا ہے اور ڈاکٹر طاہر تونسوی کی مرتب کردہ '' اقبال شناسی اور نیاز و نگار'' کے عنوان سے کتاب ، جس میں ''نگار'' اور نیا ز فتح پوری کے اقبالیات کے موضوع پر مضامین کو کتاب کی شکل میں یک جا کر دیا گیا ہے پھر ڈاکٹر اسد فیض کی اپنی کتا ب '' دید بان'' کا ذکر بھی موجود ہے جس میں اقبال پر اُن کے چار مضامین شامل ہیں ۔

'' علامہ اقبال ، منٹگمری اور خلیل احمد'' ڈاکٹر اسد فیض کا ایک خالص تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس میں انہوں نے خلیل احمد منٹگمری ، جو افسانہ نگار بھی تھے، کا ایک دریافت کردہ مضمون پیش کیا ہے جس میں انہوں نے علامہ اقبال کے منٹگمری آنے اور خلیل احمد سے ملاقات کا احوال رقم کیا ہے ۔ ڈاکٹر اسد فیض نے مفصل حواشی کے ساتھ اس مضمون کو اوراق میں محفوظ کر لیا ہے ۔ اس سے ہمیں خلیل احمد کے جذبات سے کماحقہ آ گاہی ہوتی ہے جو علامہ اقبال کو دیکھ کر اُن کے اندر پیدا ہوئے ۔خلیل احمد لکھتے ہیں :

'' چندلمحوں بعد کیا دیکھتا ہوں کہ علامہ اقبال میرے ساتھ والے کمرے سے نکل کر میری طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں ، حیران تھا کہ حضرت علامہ اقبال منٹگمری جیسے خشک اور ادب کش شہر میں کیوں کر پہنچ گئے، کہیں آنکھوں کو دھوکا تو نہیں ہو رہا ؟ شاید میرے بچپن کا خواب آج پورا ہو ، میں استقبال کے لیے آگے بڑھا میں نے کہا، 'مدت سے آرزو تھی کہ

جناب کا نیاز حاصل کروں ، شکر ہے آج اچانک میری آرزو پوری
ہوئی۔'' (۷۴)

''کریسنٹ''اسلامیہ کالج لاہور کا علمی ادبی مجلّہ ہے ۔ اس کا دسمبر ۱۹۲۵ء کا ایک شمارہ ڈاکٹر اسد فیض کو بہت اہم محسوس ہوا اور انہوں نے ''کریسنٹ کا ایک یادگار شمارہ'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اصل میں ڈاکٹر اسد فیض کو اس شمارہ میں اقبالیات کے حوالے سے دو مضامین نے اس طرف متوجہ کیا۔ ایک مضمون توخود علامہ اقبال کا بعنوان 'Self in the Light of Relativity" ہے اور دوسرا مضمون عبدالعزیز کا 'Iqbal's Poetry' ہے جس میں علامہ اقبال کی فارسی شاعری کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ اقبال کے مضمون کے حوالے سے ڈاکٹر اسد فیض کا کہنا ہے کہ :

''علامہ اقبال دراصل آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت سے بے حد متاثر
ہوئے تھے جو ۱۹۱۶ء میں طبع ہوا تھا۔ علامہ نے اپنی شاعری خصوصاً پیامِ
مشرق میں کئی جگہ آئن سٹائن کا ذکر کیا ہے ۔'' (۷۵)

اور عبدالعزیز کے مضمون کو بقول ڈاکٹر اسد فیض '' انگریزی زبان میں لکھا جانے والا اولین تنقیدی مضمون قرار دیا جا سکتا ہے ۔'' (۷٦) انہی مضامین کی اہمیت کے پیشِ نظر ڈاکٹر اسد فیض نے کریسنٹ کے اس شمارہ کو اپنے مقالہ کا موضوع بنایا۔

'' مجلّہ ایسٹ اینڈ ویسٹ اور اقبال شناسی'' ڈاکٹر اسد فیض کا ایک اور اہم مقالہ ہے۔'' ایسٹ اینڈ ویسٹ' ' کا شمار بیسویں صدی کے نصف اول میں انگریزی میں طبع ہونے والے اہم جرائد میں ہوتا ہے ۔ ڈاکٹر اسد فیض نے اس مقالہ میں اسی رسالہ میں ہونے والے اقبالیاتی کام کو اپنا موضوع بنایا ہے اور تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ :

'' 'ایسٹ اینڈ ویسٹ' میں علامہ اقبال پر پہلا مضمون اپریل ۱۹۱۷ ء کے
شمارہ نمبر ۱۲ میں طبع ہوا ہے۔ اسی کا نام 'Iqbal's Poetry' ہے جو

رسالہ کے سولہ صفحات پر مشتمل ہے ۔'' (۷۷)

اسی طرح '' ایسٹ اینڈ ویسٹ'' میں شائع ہونے والی اقبال پر دیگر تحریروں کی تفاصیل بھی بتائی ہیں اور اقبال شناسی کے ذیل میں اس کی خدمات کا اعتراف کیا ہے ۔

ڈاکٹر اسد فیض کے اقبالیات کے حوالے سے جب ہم اُن کے مجموعی کام پر نگاہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اسد فیض بڑی دیدہ ریزی اور جاں فشانی سے اقبال پر ہونے والے کاموں کا جائزہ لیتے ہیں۔ خاص طور پر ملتان میں ہونے والے اقبالیاتی ادب پر اُن کی نظر بہت گہری اور کل وقتی ہے ۔ ہم ڈاکٹر اسد فیض کو بلا شبہ ملتان میں ہونے والے اقبالیاتی ادب کا ماہر کہہ سکتے ہیں اور اس میدان میں اُن کا اور کوئی ثانی نہیں ۔

حوالہ جات

۱۔اسد فیض ، ڈاکٹر ،'' ملتان میں اقبال شناسی''، اسلام آباد ،نیشنل بک فاؤنڈیشن ، ۱۹۹۹ء،ص:ب

۲۔تفصیل کے لیے دیکھیے : ایضاً۔،ص: ۲ تا ۴

۳۔روبینہ ترین ، ڈاکٹر : '' ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ'' ،ملتان ، بیکن بکس، ۱۹۸۹ء،ص : ۳۸۴

۴۔کرم الٰہی بدر : '' تاریخِ ملتان''، لاہور، رہبر ایجنسی،۱۹۷۸ء،ص: ۲۱

۵۔طاہر تونسوی ، ڈاکٹر ،'' ملتان میں اُردو شاعری''، لاہور ، سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۴ء،ص:۱۰

۶۔ انور سدید ، ڈاکٹر : '' اُردو ادب کی مختصر تاریخ''، اسلام آباد ، مقتدرہ قومی زبان ، ۱۹۹۱ء،ص:۶۹

۷۔''ملتان میں اقبال شناسی''،ص:۹

۸۔بحوالہ مہر عبد الحق ، ڈاکٹر : '' پیام فرید''، ملتان ، سرائیکی ادبی بورڈ، ۱۹۸۷ء،ص: ۳

۹۔'' ملتان میں اقبال شناسی''،ص:۱۲

۱۰۔ایضاً، ص:۱۴

۱۱۔ایضاً ، ص :۱۵

۱۲۔ایضاً، ص:۱۷

۱۳۔ایضاً، ص:۱۹

۱۴۔ایضاً، ص:۲۶

۱۵۔ایضاً، ص:۲۹ تا ۳۰

۱۶۔اسد ملتانی: مشمولہ ماہنامہ''ماہ نو''، کراچی ، شمارہ نمبر ۵، جلد نمبر۳،مئی ،۱۹۵۰ء ص ۶۰

۱۷۔''ملتان میں اقبال شناسی''،ص: ۳۷ اور ۳۸

۱۸۔ایضاً، ص:۴۸

۱۹۔اسلم انصاری، ڈاکٹر: '' ملتان یونیورسٹی میگزین'' (دانائے راز نمبر)، ملتان ، ملتان یونیورسٹی

۷۷۔۱۹۷۸ء،ص:۱۵۱

۲۰۔''ملتان میں اقبال شناسی''،ص:۵۰

۲۱۔ایضاً، ص:۵۲

۲۲۔ایضاً، ص:۵۴

۲۳۔ایضاً، ص:۵۲

۲۴۔ایضاً، ص:۵۳

۲۵۔ایضاً، ص:۶۰

۲۶۔عبدالرحمٰن ،منشی : '' اقبال اور مسٹر'' ، لاہور، گوشۂ ادب ، ۱۹۵۵ء ،ص : ۸۵

۲۷۔''ملتان میں اقبال شناسی''،ص: ۶۱

۲۸۔ایضاً، ص:۶۳

۲۹۔مشمولہ'' اوراق'' ، لاہور، جلد نمبر۲۲، شمارہ نمبر ۱۱ تا ۱۲، نومبر دسمبر ۱۹۸۷ء،ص: ۴۶ تا ۵۵

۳۰۔مہر،عبدالحق ، ڈاکٹر: '' جاوید نامہ اقبال'' ، ملتان ، سرائیکی ادبی بورڈ ،۱۹۷۴ء،ص: ۱۳

۳۱۔''ملتان میں اقبال شناسی''،ص:۷۲

۳۲۔ایضاً، ص:۷۳

۳۳۔ایضاً، ص:۸۳

۳۴۔ایضاً، ص:۸۹

۳۵۔عبدالرحمٰن ،منشی : '' علامہ اقبال کی کردار کشی'] ، ملتان ، جاوید اکیڈمی ، ۱۹۸۸ء،ص: ۱۸

۳۶۔''ملتان میں اقبال شناسی''،ص:۹۲ تا ۹۳

۳۷۔ایضاً، ص:۹۴

۳۸۔افتکار حسین شاہ ، پروفیسر :''اقبال اور پیروی شبلی'' ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء،ص: ۹

۳۹۔''ملتان میں اقبال شناسی'' ،ص: ۹۴

۴۰۔رفیع الدین ہاشمی ، ڈاکٹر ، ۰ مرتب)،'' ۱۹۸۵ء کا اقبالیاتی ادب : ایک جائزہ'' ، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان ، ۱۹۸۶ء۳۷

۴۱۔جابر علی سید: '' اقبال کا فنی ارتقا''لاہور، بزمِ اقبال ، ۱۹۷۸ء،ص۲۱

۴۲۔جابر علی سید: '' اقبال ۔ ایک مطالعہ''، لاہور، بزمِ اقبال ، ۱۹۸۵ء،ص:۵۴

۴۳۔''ملتان میں اقبال شناسی''،ص: ۱۰۴ تا ۱۰۵

۴۴۔اسلم انصاری ، ڈاکٹر : '' شعر وفکر اقبال'' ملتان ،مجلس فکر اقبال ، ۱۹۹۹ء

۴۵۔اسلم انصاری ، ڈاکٹر: ''اقبال ۔ عہد آفرین''، ملتان ، کاروانِ ادب ، ۱۹۸۷ء،ص: ۱۸

۴۶۔'' ملتان میں اقبال شناسی''،ص: ۱۰۶

۴۷۔ایضاً، ص:۱۱۰

۴۸۔عاصی کرنالی : ''چراغِ نظر''، ملتان ، مکتبہ عاصی کرنالی ،۱۹۹۲ء،ص: ۲۷

۴۹۔''ملتان میں اقبال شناسی''،ص: ۱۱۲ تا ۱۱۳

۵۰۔ایضاً، ص:۱۱۴

۵۱۔اے بی اشرف ، ڈاکٹر : غالب اور اقبال''، ملتان،بیکن بکس ، ۱۹۸۸ء،ص: ۵

۵۲۔''ملتان میں اقبال شناسی'' ،ص: ۱۱۵

۵۳۔ایضاً، ص:۱۱۷

۵۴۔انوار احمد ،ڈاکٹر: ''تحریک پاکستان میں علامہ اقبال کا کردار'' ، ملتان ، بیکن بکس، ۱۹۹۳ء، ص:۵۹

۵۵۔''ملتان میں اقبال شناسی''،ص: ۱۲۰ تا ۱۲۱

۵۶۔ایضاً، ص:۱۲۱

۵۷۔ایضاً، ص:۱۲۳

۵۸۔ساجد ،عبدالمجید :'' اقبال : حیات عصر'' ، ملتان ، ادارہ تحقیق و ادب ،۱۹۹۴ء،ص: ۳۴

۵۹۔''ملتان میں اقبال شناسی''،ص: ۱۲۶ تا ۱۲۷

۶۰۔ایس ایم منہاج الدین ، ڈاکٹر: '' افکار و تصوراتِ اقبال''، ملتان ، کاروانِ ادب ، ۱۹۸۵ء، ص:۲

۶۱۔''ملتان مین اقبال شناسی''،ص: ۱۲۸

۶۲۔ایضاً، ص:۱۳۰

۶۳۔ایس ایم منہاج الدین ، ڈاکٹر: ''افکارِ اقبال''، ملتان ، کاروانِ ادب ، ۱۹۸۹ء،ص: ۷

۶۴۔''ملتان میں اقبال شناسی''،ص: ۱۳۰

۶۵۔ایضاً، ص:۱۳۱

۶۶۔ایضاً، ص:۱۳۴

۶۷۔ایضاً، ص:۱۴۷

۶۸۔ ادیب سہیل: ''ملتان میں اقبال شناسی''، مشمولہ'' قومی زبان''، کراچی، جلدنمبر۷۲، شمارہ نمبر ۹، ستمبر۲۰۰۰ء، ص: ۸۳

۶۹۔''ملتان میں اقبال شناسی''،ص:۱۹۶

۷۰۔اسد فیض ، ڈاکٹر: '' دید بان''، ملتان ، ہم عصر پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص : ۹۶ تا ۹۷

۷۱۔ایضاً، ص:۹۸

۷۲۔اسد فیض، ڈاکٹر: '' ملتان مین اقبال کے ملاقاتی'' ، مشمولہ '' قومی زبان''، کراچی ، اپریل ۱۹۹۹ء، ص: ۴۲

۷۳۔اسد فیض ، ڈاکٹر: ملتان میں اقبالیاتی ادب کا جائزہ'' (۱۹۹۵ء سے ۱۹۹۹ء تک)،مشمولہ'' ہم عصر ، ملتان ، جلد :۲، شمارہ :۸ تا ۱۳، جنوری تا مراچ ، ۲۰۰۰ء ص: ۳۸

۷۴۔اسد فیض ، ڈاکٹر: '' علامہ اقبال ، منٹگمری اور خلیل احمد'' ، مشمولہ ''روشنائی '' ، کراچی ، جلد ۱۵، شمارہ : ۶۵، اپریل تا جون ۲۰۱۶ء ص: ۲۷ تا ۲۸

۷۵۔اسد فیض، ڈاکٹر: '' کریسنٹ کا ایک یاد گار شمارہ'' مشمولہ'' قومی زبان ، کراچی ، جولائی ۱۹۹۷ء، ص: ۲۲

۷۶۔ایضاً، ص:۲۳

۷۷۔''دید بان''، ص:۱۱۸

☆☆☆

باب سوم:

اسد فیض کی منٹو شناسی

سعادت حسن منٹو اُردو کے ایک بہت بڑے افسانہ نگار ہیں ۔ انہوں نے بلا شبہ اُردو افسانہ کو اوج پر پہنچانے میں اپنا کردار بہ خوبی ادا کیا ہے ۔ انہیں فحش نگار بھی کہا گیا، جنس زدہ بھی قرار دیا گیا مگر اس سب کے باوجود اُن کی افسانوی قوت کو کوئی نہ دبا سکا ۔ منٹو پر اور بھی ہزاروں اعتراضات کیے گئے مثلاً بلا وجہ چونکانے والا افسانہ نگار بھی کہا گیا، سستی جذباتیت کو پھیلانے والا بھی کہا گیا حتٰی کہ کچھ لوگوں نے اس کی افسانہ نگاری کو ''ڈرامے بازی'' کا نام بھی دیا۔ اس کا ایک خوب صورت جواب محمود احمد قاضی نے اپنے ایک مضمون'' نایاب منٹو'' میں دیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

'' فن کار منٹو کا کمال ہی یہ ہے کہ وہ معاشرے کے ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکر پھینکتا رہتا ہے جس سے چاہے تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی ایک ارتعاش ضرور پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں کو اس کے اس طرح چونکانے پر اعتراض رہا ہے ۔ وہ اسے سستی جذباتیت اور اس کی طبیعت کی ڈرامے بازی کا ایک ہنر قرار دیتے ہیں جب کہ دنیا کے دوسرے بڑے فن کاروں نے بھی ایسا کیا ہے۔ اگر معاشرہ حقائق سے آنکھیں بند کر کے اپنی ٹھوڑی ہتھیلی پر رکھے اونگھ رہا ہو تو کیا اسے چونکانا ضروری نہیں ہو جاتا ؟ آخر اس مستقل اونگھ سے اسے کوئی تو نجات دلانے والا ہونا چاہیے اور اگر یہ کام منٹو نے اپنے ذمے لیا ہے تو اس نے کیا برائی کی ہے۔''(۱)

یہی حقیقت ہے کہ منٹو نے معاشرے کو جھنجھوڑنے کا کام کیا ہے ۔ انہوں نے اپنے افسانوں سے سماج کو اُس کی بے حسی دکھانے کی کوشش کی ہے اور صرف یہ نہیں بلکہ اپنے سماج کو جگانے کی بھی اپنی سی کاوش کی ہے۔ اور یہ انہی کا خاصہ ہے ۔ اسی لیے انہیں اُردو کے اہم ترین چند بڑے افسانہ نگاروں میں شمار

کیا جاتا ہے اور یہ کچھ غلط نہیں ۔

سعادت حسن منٹو زود نویس تھے۔ انہوں نے سینکڑوں افسانے لکھے، بے شمار تراجم کیے، کئی ڈرامے لکھے ، بہت سے خاکے قلم بند کیے، فلموں کے سکرپٹ لکھے اور چبھتی ہوئی مضمون نگاری بھی کی ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا لکھا ہوا تمام سرمایہ اپنے تمام تر ریکارڈ کے ساتھ محفوظ نہیں ہو سکا ۔ جب کہ اُن کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ اُن کی ایک ایک تحریر بلکہ ایک ایک لفظ محفوظ ہونا چاہیے۔ ادبی اور تہذیبی سطح پر ترقی یافتہ قومیں اپنے اکابرین و مشاہرین کی ایک ایک بات ایک ایک لفظ محفوظ کرنا، اپنا شیوہ ہی نہیں سمجھتیں بلکہ اُسے ممکن بھی بناتی ہیں ۔ اسی ادبی اور تہذیبی تقاضے کے پیشِ نظر منٹو کی تحریروں کو پچھلے کئی برسوں سے اکٹھے کرنے اور مدون کر کے شائع کرنے کا کام جاری ہے۔ مختلف ادارے اور محققین و ناقدین اس مقصد کے لیے شب وروز کی محنت صرف کر رہے ہیں ۔ سعادت حسن منٹو کے پاک وہند میں کئی افسانوی کلیات شائع ہو چکے ہیں مگر سب ابھی تک نامکمل رہے ہیں کہ منٹو کی کوئی نہ کوئی تحریر پھر دریافت ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں سنگ میل پبلی کیشنز ، لاہور نے چھ جلدوں میں منٹو کی تمام تحریروں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ چھٹی جلد میں جسے '' منٹو باقیات'' کا نام دیا گیا، سعادت حسن منٹو کے وہ تراجم، افسانے اور خطوط وغیرہ شامل کیے ہیں جو پہلی پانچ جلدوں میں نہیں آ سکے۔(۲) پھر خالد ارمان نے '' باقیاتِ منٹو'' کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی جس میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ :

> '' اس کتاب کے پہلے حصے میں سعادت حسن منٹو کے ۹ ایسے گراں قدر اور نایاب افسانے شامل ہیں ، جن سے اُردو ادب کے قارئین آج تک محروم رہے ہیں ۔ یہ افسانے پہلی بار اس کتاب کے ذریعے اُردو زبان کے مطبوعہ افسانوی ادب کا حصہ بن رہے ہیں ۔ اسی طرح دوسرے حصے کے اکیس افسانے رسائل و جرائد میں شائع تو ہوئے لیکن پھر ذہنوں سے ایسے اترے کہ اُردو کتابوں کے قارئین کی وسیع دنیا تک کبھی نہ پہنچ سکے۔ یہ کتاب سعادت حسن منٹو کے ان ۳۰ تخلیقی شاہ کاروں کو دریافت کر کے اُردو زبان و ادب کی مطبوعہ کتب کے ذخیرے کا حصہ بنانے کی سعی ہے۔''(۳)

اس کتاب کے مرتب کا یہ دعویٰ جتنا بڑا ہے اس کی حقیقت اتنی ہی بودی ہے ۔اصل حقیقت کیا ہے؟ اس سے ایم۔ خالد فیاض نے بہ خوبی پردہ اٹھایا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سعادت حسن منٹو کی تحریروں کو مارکیٹ میں بیچنے کے لیے جھوٹ کا کاروبار کس قدر عروج پر ہے۔ ایم ۔ خالدفیاض سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہونے والی کتاب'' منٹو باقیات'' اور خالد ارمان کی مرتب کردہ'' باقیاتِ منٹو'' دونوں کے حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> '' منٹو کی باقیات کے سلسلے میں مجھے دو مجموعوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایک سنگِ میل کا 'منٹو باقیات' اور دوسرا خالد ارمان کا مرتب کردہ 'باقیاتِ منٹو' ۔سنگِ میل والوں کی ' منٹو باقیات' محض ان معنوں میں 'باقیات' ہے کہ منٹو کی جو تحریریں سنگِ میل کے دیگر مجموعوں میں آنے سے رہ گئی تھیں وہ یہاں جمع کر دی گئی ہیں جب کہ خالد ارمان کی مرتب کردہ تحریریں کن معنوں میں ' باقیات' یا 'نادر و نایاب' کے ذیل میں آتی ہیں ، اس کی وضاحت سوائے خالد ارمان کے اور کوئی نہیں کر سکتا کیوں کہ یہاں شامل کیے گئے تمام افسانے سنگِ میل کے مجموعہ 'منٹو کہانیاں' مطبوعہ ۱۹۹۵ء میں شائع ہو گئے ہیں اور اس سے پہلے یہ افسانے بلراج مین را کے مرتب کردہ مجموعہ ' منٹو کے گم شدہ اور غیر مطبوعہ افسانے' میں جو۱۹۹۲ء میں شائع ہوا، مدون ہو چکے ہیں۔''(۴)

یہ بات اس لیے بالکل سچ ہے کہ جب ہم'' منٹو کہانیاں'' سنگ میل پبلی کیشنز والا مجموعہ کھولتے ہیں تو خالد ارمان کے پیش کردہ تمام افسانے وہاں موجود دکھائی دیتے ہیں ۔(۵) حیرت ہوتی ہے کہ محققین ایسے کھلے جھوٹ کیسے بول لیتے ہیں ، لیکن یہ بھی تو حیرت کی بات ہے کہ ہم نے خالد ارمان کو محقق مان لیا اور اُن کی بنیاد پر دیگر محققین پر الزام عائد کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خالد ارمان کوئی محقق نہیں ، انہوں نے تو کاروباری نقطہ نظر کے تحت ان افسانوں

کو مرتب کر کے غیر مطبوعہ کا عنوان چسپاں کر دیا ۔ لہٰذا اُن کا ذکر ہی کیا؟ اصل محققین ایسی حرکتوں کے مرتکب نہیں ہوا کرتے ۔ وہ تحقیق کو وقتی مفاد یا چند ٹکوں کے منافع کے لیے استعمال میں نہیں لاتے ۔ وہ اپنی ان تھک کوششوں او رمسلسل جدوجہد سے واقعتاً '' نادر و نایاب'' تحریروں کی دریافت کرتے ہیں ۔ اُن کی نوک پلک سنوار تے ہیں او ربغیر کسی لالچ کے ادبی روایت کے حوالے کر دیتے ہیں ۔ ڈاکٹر اسد فیض ایسے ہی محققین کی فہرست میں آتے ہیں ۔

ڈاکٹر اسد فیض کی سعادت حسن منٹو سے محبت مسلم ہے ۔ وہ بہت عرصہ سے منٹو کی تحریریں دریافت کرنے کا فریضہ سر انجام دے رہے ہیں۔ اُن کا ماننا ہے کہ بڑے تخلیق کاروں کی ایک ایک تحریر ادبی خزانے کا حصہ بننی چاہیے، چاہے وہ کتنی ہی کم زور تحریر کیوں نہ ہو ۔ کیوں کہ بڑے تخلیق کار کی کم زور تحریر بھی ان معنوں میں اہمیت رکھتی ہے کہ بڑے تخلیق کار کے کم زور تخیل کی عکاس ہوتی ہے ۔ وہ ہمیں بتاتی ہے کہ بڑے سے بڑا تخلیق کار بھی ہر تحریر'' عظیم'' تخلیق نہیں کرتا۔ پھر یہ کہ بڑے تخلیق کار کی کم زور تحریر بھی ،کم زور تخلیق کار کی مضبوط تحریر سے بہر حال تخلیقی سطح پر بڑی ہی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اسد فیض نے اسی لیے منٹو کی کچھ غیر مدون اور کچھ گم شدہ تحریروں کو تلاش کر کے نہ صرف یہ کہ پہلے مختلف رسائل میں شائع کرایا بلکہ بعد میں اُن تحریروں کے ساتھ ،شہزاد منظر کی تلاش کردہ منٹو کی چند تحریروں کو بھی شامل کر کے اور منٹو پر لکھے گئے اپنے کچھ اہم مضامین کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کر دیا۔اس کتاب کا نام انہوں نے '' منٹو کی گم شدہ تحریریں'' تجویز کیا اور اپنے ساتھ شہزاد منظر کو بھی شریک مرتب ٹھہرایا۔ ڈاکٹر اسد فیض اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :

> '' مجھے بھی منٹو کے افسانوں اور مضامین کی تلاش سے دلچسپی پیدا ہوئی اور میں نے سعادت حسن منٹو کے بارے میں تحقیقی مضامین لکھے جو پاکستان اور انڈیا کے موقر ادبی جرائد میں شائع ہوئے ۔ اس مسودے کی تکمیل کے لیے میں نے اس دوران منٹو کی گم شدہ تحریروں کی تلاش کا عمل جاری رکھا۔ موجودہ صورت میں اس کتاب میں میرے منٹو پر لکھے گئے مضامین کے علاوہ میرے تلاش کیے گئے منٹو کے تحریر کردہ فیچر، افسانے بھی شامل ہیں ۔ اس کتاب میں شہزاد منظر کی تلاش کردہ تین منٹو کی

تحریریں باقی رہی ہیں جو تاحال غیر مدون ہیں ۔'' (۶)

ڈاکٹر اسد فیض نے اپنی اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے ۔ پہلا حصہ '' منٹو کی غیر مدون تحریریں'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں منٹو کی تیرہ تحریریں شامل ہیں ، جس میں منٹو کے پانچ تراجم اور سات طبع زاد تحریریں ہیں ۔ ایک ڈرامائی فیچر جو بیگم منٹو کے نام سے شائع ہوا تھا، اُسے ڈاکٹر اسد فیض نے یہاں اس دعوے کے ساتھ شامل کیا ہے کہ '' یہ دراصل سعادت حسن منٹو کی تحریر ہے۔'' (۷) اورایم۔ خالد فیاض نے یوں اس پر اپنی مہر تصدیق ثبت کی ہے کہ '' اگر چہ اس بات کے کوئی خارجی شواہد تو موجود نہیں ، مگر داخلی شواہد واقعی اس کی گواہی دیتے ہیں ۔''(۸)

یوں یہ ایک انتہائی اہم تحریر کا درجہ اختیار کر لیتی ہے ۔ اس کے علاوہ پانچ تراجم تو خاصے کی چیز ہیں ہی۔ گورکی کے نام چیخوف کے خط اب بھی فکشن کی تنقید میں اہمیت کے حامل ہیں ۔ اگر چہ چیخوف کے خطوط کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں او ران میں چیخوف کے لکھنے کا ایسا انداز سامنے آیا جس میں حقیقت پسندی اور شریفانہ انکسار کی جھلک دکھائی دیتی ہے ۔ سجاد حارث نے ان خطوط کے مطالعے کے بعد سچ کہا تھا کہ :

> ''اس (چیخوف) کے خطوط میں ۔۔۔۔ چیخوف کی جو تصویر اور شخصیت بنتی ہے ، اس میں معقولیت ، توازن فکر، جرأت ، اعتدال اور شخصی دلکشی نمایاں خصوصیات ہیں ۔'' (۹)

سعادت حسن منٹو نے رسالہ '' عالمگیر'' کی مئی ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں چیخوف کے گورکی کے نام لکھے گئے خطوط کا ترجمہ کر کے شامل کیا۔ یہ خطوط چیخوف کی شخصی خوبیوں کے ساتھ ساتھ چیخوف کی تنقیدی بصیرت کا بھی منہ بولتا ثبوت ہیں ۔

ان کے علاوہ چیخوف کا ایک افسانوی ترجمہ '' ساحرہ'' شامل ہے۔معلوم نہیں اس سے پہلے منٹو کا یہ شاہکار ترجمہ ہمارے محققین کی نظر میں کیوں نہیں آیا۔ اس سے پہلے محمد سعید نے '' نوادراتِ منٹو'' کے عنوان سے ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب مرتب کی جس میں منٹو کا یہ ترجمہ شامل نہ ہو سکا۔(۱۰) اس کے علاوہ احمد سلیم نے '' روسی ادب کے شاہکار'' کتاب مرتب کی جس میں سعادت حسن منٹو کے روسی ادب کے تراجم جمع کیے

گئے ہیں مگر'' ساحرہ'' یہاں بھی موجود نہیں ۔ (۱۱) لہٰذا یہ اس کتاب کی اہم دریافت بن جاتی ہے۔ حال ہی میں ایک کتاب'' انتون چیخوف'' کے عنوان سے آئی ہے جس میں چیخوف کے افسانوں اور ڈراموں کے اُردو تراجم کے ساتھ ساتھ اُردو میں لکھے جانے والے چیخوف کے تنقیدی مضامین بھی شامل ہیں ، اس کے مرتب محمد ابو بکر فاروقی نے منٹو کے اس ترجمہ کو وہاں شامل کیا ہے اور اس کا ماخذ ڈاکٹر اسد فیض کی یہی کتاب ہے۔(۱۲)

اس کے علاوہ ایک اور روسی شاہکار'' سرخ پھول'' کے عنوان سے موجود ہے۔ یہ روس کے ایک کم معروف مگر منفرد جواں مرگ افسانہ نگار گارشن کے افسانہ''A RED FLOWER'' کا اُردو ترجمہ ہے۔ یہ اس کی زندگی کا آخری شاہکار ہے ۔ گارشن نے اس افسانہ کو تحریر کرنے کے بعد خود کشی کر لی تھی ۔ اُس کے ذہن پر اس جنگ کا بہت اثر تھا جو روس اور ترکی کے درمیان ہوئی اور جس میں گارشن نے ایک سپاہی کی حیثیت سے شرکت بھی کی تھی ۔ اس جنگ میں گارشن کی شمولیت کی وضاحت اُردو زبان میں روسی ادب کی تاریخ مرتب کرنے والے محمد مجیب نے یوں کی ہے، لکھتے ہیں :

''لڑائی میں گارشن، اس سبب سے نہیں شریک ہوا تھا کہ اُسے وطن سے محبت اور ترکوں سے نفرت تھی۔اُس کا خیال تھا کہ اُسے ان مصیبتوں سے بچے رہنے کا کوئی حق نہیں ، جن میں ہزاروں بے گناہ خوامخواہ مبتلا کر دیے گئے ہیں ۔'' (۱۳)

ڈاکٹراسد فیض نے گارشن کے اس افسانہ کو جو اصل میں شہزاد منظر کا تلاش کردہ تھا،'' سرخ پھول'' کے عنوان سے شامل کیا ہے جب کہ محمد سعید نے بھی کراچی کے ایک ادبی جریدہ میں اس افسانہ کا متن شائع کروایا ہے وہاں اس کا عنوان صرف'' پھول'' درج ہے۔ (۱۴) اس ترجمہ سے متعلق محمد سعید کی رائے یہ ہے کہ :

''منٹو نے اس نوعیت کے جتنے ترجمے کیے ہیں ، وہ عموماً آزاد ترجموں کی ذیل میں آتے ہیں ، جن میں اکثر منظر نگاری کو ترجمے میں نظر انداز

کر جاتے ہیں ۔ یہ بھی آزاد ترجمہ ہے، لیکن اس میں سے ترجمہ کرتے ہوئے منٹو نے کوئی حصہ حذف نہیں کیا ۔ بڑے جامع انداز میں مکمل افسانے کا ترجمہ کیا ہے ۔'' (۱۵)

سعادت حسن منٹو نے اس افسانے کا صرف ترجمہ ہی نہیں کیا تھا اس پر اپنی ناقدانہ رائے کا بھی اظہار کیا تھا جو تنقیدی سطح پر منٹو کی اعلیٰ بصیرت کی غماز بھی ہے ۔منٹو نے جب رسالہ'' عالم گیر'' کے روسی ادب نمبر کے لیے ایک مضمون'' روسی ادبا کا تعارف'' کے عنوان سے لکھا تو وہاں انہوں نے گارشن کے ساتھ ساتھ اُس کے اس افسانے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار بھی کیا۔ انہوں نے بڑے اعتماد سے لکھا کہ :

'' گارشن کے آخری افسانے ''**A RED FLOWER**'' میں دنیا کی بے اعتنائی اور سرد مہری کے خلاف ایک زبردست احتجاج کی صدا بلند کی گئی ہے ۔ ایک شخص خود میں اپنے ہم جنسوں کی مشکلات کو دیکھنے کی تاب نہ پاتے ہوئے از خودرفتہ ہو جاتا ہے ۔ پاگل خانے میں اُس کا مضطرب دماغ نیکی اور بدی کے متعلق ایک نیا نظریہ قائم کرتا ہے ۔ وہ ایک گلِ لالہ میں ، جو پاگل خانے سے ملحقہ باغ میں اُگا ہوتا ہے ، دنیا کی تمام بدیوں کا تجسم دیکھتا ہے۔ اس دیوانے کے دماغ میں اس بدی کا خاتمہ کر دینے کا خیال گارشن نے نہایت وضاحت سے قلم بند کیا ہے۔''(۱۶)

منٹو ؛ مرزا غالبؔ کے بہت بڑے مداح تھے ۔(۱۷) ان کی تحریروں میں غالبؔ کے اشعار کا برمحل استعمال متعدد مضامین اور خاکوں میں ملتا ہے ۔ اسی طرح منٹو کی کئی کہانیاں بھی غالبؔ کے اشعار سے مزین ہیں اور افسانہ'' جھوٹی کہانی '' کا مرکزی کردار تو بات بات پر غالبؔ کے پیچیدہ اور فلسفیانہ اشعار پڑھتا ہے۔ پرویز انجم نے '' منٹو ۔غالبؔ کا پرستار'' کے عنوان سے پوری کتاب ترتیب دی ہے جس میں اُنہوں نے غالبؔ پر لکھے گئے منٹو کے مضامین اور فلمی سکرپٹ مرتب کر دیے ہیں اور ایک طویل دیباچہ لکھ کر'' منٹو کی غالب

پرستی'' کو ثابت کیا ہے ۔مگر حیرت ہے کہ وہ غالبؔ پر منٹو کا ایک مضمون '' غالبؔ کی وضعداری'' شامل کرنے سے رہ گئے۔ یقیناً اُن کی رسائی میں یہ مضمون نہیں آیا ہوگا۔ ڈاکٹر اسد فیض نے یہ مضمون ہفت روزہ '' شیرازہ'' لاہور کی ۸ فروری ۱۹۴۱ ء کی اشاعت سے کھوج نکالا اور اب یہ اُن کی اس کتاب کی زینت ہے۔ اس مضمون کی اہمیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انتظار حسین نے اپنے ایک کالم میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اس مضمون کو بے حد سراہا ہے اور پسند کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''بعض مضامین ،فیچر اور ایسے اور ٹکڑے بہت دلچسپ ہیں اور اچھا ہوا کہ وہ اب ہماری دسترس میں ہیں ۔ اس میں ایک دلچسپ مضمون ہے 'غالبؔ کی وضعداری' غالبؔ سے منٹو کو کتنی دلچسپی تھی یہ تو ہمیں معلوم ہی ہے۔ یہاں منٹو نے غالبؔ کی وضعداری کے واقعات سے کیسے ڈرامائی رنگ کا ایک فیچر مرتب کیا ہے۔''(۱۸)

اس فیچر میں واقعی سعادت حسن منٹو نے ڈرامائی انداز سے انتہائی خوبی سے غالبؔ کی وضعداری کو بیان کیا ہے ۔ یہاں یہ بات بھی خاطر نشان رہے کہ پرویز انجم نے اپنی کتاب میں '' غالب اور سرکاری ملازمت'' کے عنوان سے جو مضمون شاملِ کتاب کیا ہے اُس کا موضوع ڈاکٹر اسد فیض کے پیش کردہ اس مضمون یا فیچر '' غالبؔ کی وضعداری'' سے ملتا ہے مگر متن بالکل مختلف ہے ۔ پرویز انجم نے اپنا متن منٹو کے مجموعہ '' تلخ ، ترش اور شیریں'' سے لیا ہے (۱۹) جب کہ ڈاکٹر اسد فیض نے روز نامہ ''شیرازہ'' سے ۔ اس سے ایک بات سامنے آتی ہے کہ سعادت حسن منٹو ایک ہی موضوع پر دو دو متن لکھنے کا ہنر جانتے تھے اور پیسوں کی خاطر ایک متن کو تھورا تبدیل کر کے اور عنوان بدل کر دوسری جگہ شائع کروا لیتے تھے۔

بہر حال ڈاکٹر اسد فیض کے پیش کردہ اس متن سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ اصل اور پرانا متن یہ ہے جب کہ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی پتہ چلا کہ پرویز انجم نے اس طرف توجہ نہیں دی ۔ اُن کی نظر میں غالبؔ سے متعلق منٹو کا یہ متن نہیں تھا جو ایک محقق کے لیے اچھی بات نہیں ۔

اس کے بعد ڈاکٹر اسد فیض نے سعادت حسن منٹو کے تین افسانے پیش کیے ہیں جو اس سے پہلے ہمیں کہیں اور نظر نہیں آتے ۔ ایک '' گلاب کا پھول'' جو ایک افسانچہ نما ہے اور منٹو کی مختصر نگاری کا اچھا نمونہ

کہا جا سکتا ہے ۔ دوسرا افسانہ '' بارہ روپے '' ہے ، جو ایک انتہائی المیہ کہانی ہے ۔ اور تیسرا '' دست بریدہ بھوت '' جو ہلکے پھلکے اسلوب میں لکھی ہوئی شگفتہ سی کہانی ہے۔ تینوں افسانوں کا رنگ ڈھنگ مختلف ہے ۔ '' گلاب کا پھول '' تو شاعرانہ نثر کا ایک اظہاریہ ہے اور خوب ہے مگر '' بارہ روپے '' ایک ایسا المیہ ہے کہ دل میں گھر کر جاتا ہے ۔ اس افسانے کے موضوع سے متعلق ڈاکٹر اسد فیض نے خود ان الفاظ میں وضاحت کی ہے ۔ لکھتے ہیں :

> '' یہ افسانہ تقسیمِ ہند کے واقعات پر مشتمل ہے اور ایک کوچوان عیدے کی کہانی ہے منٹو نے ایک عام تانگے والے عیدے کی ذات کے اصل جوہر شرافت ، انسان دوستی اور محبت کے لازوال رشتہ کو اس میں بیان کیا ہے ۔ اس افسانے کا اصل موجوع فلسفہ وجودیت ہے کہ انسان قدرت کے سامنے اپنی تمام کوششوں کے باوجود کتنا بے بس ہے ۔۔۔۔منٹو نے اس افسانے کو المیہ انجام سے دو چار کیا ہے ۔ حالاں کہ عیدے کی شادی پر ختم کر کے وہ اسے اچھے موڑ پر اختتام پذیر کر سکتا تھا۔ یہاں منٹو اپنی ذاتی زندگی میں معاش کے مسئلے اور اس دور میں شب و روز کی مجبوریوں اور تذلیل کے زیرِ اثر فلسفہ ٔ وجودیت کا قائل ہوتا دکھائی دیتا ہے ۔''(۲۰)

سعادت حسن منٹو کا ایک افسانہ '' دس روپے بھی تھا ۔مگر یہ افسانہ '' بارہ روپے '' اُس سے قطعاً مختلف ہے ۔ ڈاکٹر خالد اشرف کی یہ بات بالکل درست ہے کہ '' منٹو کے افسانوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جہاں کردار اور واقعات پس ماندہ طبقات سے اخذ کیے گئے ہیں ۔''(۲۱) اس افسانے میں بھی کوچوان عیدے کا کردار اور اس کو پیش آنے والے تمام واقعات ایک انتہائی پس ماندہ طبقہ سے تعلق رکھنے والے فرد کی عکاسی کرتے ہیں ۔

'' دست بریدہ بھوت '' ایک طنزیہ افسانہ ہے ۔ اگرچہ یہ کوئی قابلِ ذکر تحریر نہیں کہی جا سکتی مگر منٹو کے اسلوب کے کتنے رنگ ہیں اور کیسے کیسے انداز ہیں ، اس کا پتہ ضرور چلتا ہے ۔ ڈاکٹر طاہرہ اقبال نے

اپنے تحقیقی مقالہ'' منٹو کا اسلوب'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ :

''وہ (منٹو) جو اسلوب اختیار کرتا ہے وہ بھی ذو معنویت لیے ہوتا ہے۔
وہ جو کہ رہا ہوتا ہے دراصل اُس کے اندر بہت سی اَن کہی باتیں صاف
جھلک دکھا رہی ہوتی ہیں ۔''(۲۲)

اس افسانہ کی یہ خوبی ہے کہ وہ منٹو کی ذو معنویت اور اَن کہی باتوں کی نشان دہی کرنے میں بہت معاون ہے ۔

سعادت حسن منٹو نے ڈرامے بھی بے شمار لکھے ۔ سات آٹھ مجموعے ڈراموں کے شائع ہوئے۔ تقریباً سو سے زیادہ ڈرامے لکھے ۔ ان میں کچھ مزاحیہ ڈرامے بھی لکھے بلکہ ان مزاحیہ ڈراموں کا الگ سے پورا مجموعہ ''آؤ'' کے عنوان سے شائع ہوا جس کے ابتدائیہ میں سعادت حسن منٹو نے کمال کی بات لکھی۔ لکھتے ہیں :

''میں بھوکا تھا۔ چناں چہ میں نے ڈرامے لکھے۔ داد اس بات کی چاہتا
ہوں کہ میرے دماغ نے پیٹ میں گھس کر یہ چند مزاحیہ ڈرامے لکھے
ہیں جو دوسروں کو ہنساتے رہے ہیں ، مگر میرے ہونٹوں پر ایک پتلی سی
مسکراہٹ بھی پیدا نہیں کر سکے ۔''(۲۳)

ممتاز شیریں نے جب منٹو کی بہترین ۱۴ تخلیقات کا انتخاب کیا تو اُس میں ایک ڈرامہ'' اس منجدھار میں'' کو بھی شامل کیا ۔(۲۴) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کی ڈرامہ نگاری کی کیا اہمیت تھی ۔

ڈاکٹر اسد فیض نے منٹو کے ایک ڈرامہ کو بھی دریافت کر کے ہمارے سامنے پیش کیا ہے ۔ اس کا عنوان ہے'' عورت اور مرد'' یہ بھی مزاحیہ ڈراموں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے ۔ اس میں ایک عورت اور مرد جو میاں بیوی ہیں ، کا دلچسپ مکالمہ زیرِ بحث ہے۔ شاید ایسے ہی ڈراموں کی بنیاد پر معروف نقاد وارث علوی نے لکھا تھا کہ :

'' منٹو مکالمہ نویسی میں مشاق تھا۔ بات سے بات پیدا کرنا، بات کا
بتنگڑ بنانا، بات چیت کو بحث میں ، کاروباری گفتگو کو جھڑپ میں ، میاں
بیوی کی نوک جھونک کو جھگڑے میں اور جھگڑے کو دلچسپ ڈرامے میں
بدلنے کے سب گُر اُسے یاد تھے ۔'' (۲۵)

ڈاکٹر اسد فیض کے دریافت کردہ اس ڈرامہ میں بھی میاں بیوی کی نوک جھونک اور جھگڑا کمال خوبی
سے بیان ہوا ہے ۔منٹو اس فن میں واقعی بڑے تاک تھے انہیں بات سے بات نکالنا اور بڑھانا خوب آتا تھا۔
یہ ڈرامہ بھی اسی فن کا اظہار ہے اسے ڈاکٹر اسد فیض نے کراچی کے ایک ماہ نامہ رسالہ'' ادب'' کی مارچ
۱۹۵۲ء کی اشاعت سے کھوج نکالا ہے ۔
سعادت حسن منٹو اپنے ڈراموں میں بھانت بھانت کے کردار اور طرح طرح کے موضوعات ڈھونڈ
لاتے تھے، جو حیران کن حد تک متاثر کرتے ہیں ۔ اسی لیے مبین مرزا جو منٹو کو اہم ڈرامہ نویس نہیں جانتے ،
یہ ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ :

'' آخری ڈرامے 'اس منجدھار میں' تک منٹو نے اس صنف میں جو کام
کیا ہے وہ اپنی مقدار کے لحاظ سے تو متاثر کن ہے ہی لیکن ساتھ ہی
ساتھ اُس کے موضوعات کا تنوع بھی قابلِ رشک ہے ۔ اپنے اطراف
کی زندگی کے اچھے بڑے اور چھوٹے بڑے کردارں سے لے کر تاریخ
کے پردۂ سیمیں پر ابھرنے والے افراد تک کو منٹو نے اپنے ڈراموں کا
موضوع بنایا ہے ۔'' (۲۶)

اس تناظر اور پیش منظر میں ڈاکٹر اسد فیض کا دریافت کردہ یہ ڈرامہ '' عورت اور مرد'' ایک خاصے کی
چیز بن جاتا ہے اور منٹو کی ڈرامہ نگاری کے ذکر کو ممکن بناتا ہے۔
یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ سعادت حسن منٹو ادبی نقاد بھی تھے ۔ انہوں نے بہت سے تنقیدی
مضامین بھی لکھ رکھے ہیں ۔ اُن کی تنقید میں جو کاٹ ہے وہ سماجی شعور اور ذہنی بالیدگی کا نتیجہ ہے ۔ اُن کی

ادبی تنقید کے شاہکار مقدموں کا وہ احوال ہے جن کا سامنا منٹو کو کرنا پڑا اور بعد میں جن پر انھوں نے مضامین لکھ کر ادبی سطح پر بڑے اہم قسم کے سوالات اٹھائے ۔ اس کے علاوہ دیگر تنقیدی مضامین بھی اُن کی ادبی بصیرت اور تنقیدی نظر کی گہرائی کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں ۔ اُن کی اسی ادبی تنقید کے پیشِ نظر ایم ۔ خالد فیاض لکھتے ہیں :

'' منٹو سماجی نقاد تو تھے ہی ، لیکن وہ ادبی نقاد بھی کمال کے تھے ۔فکشن پر جو چند مضامین انھوں نے تحریر کیے، اُن کا شمار اُردو کی فکشن کی تنقید کے اعلیٰ نمونوں میں کیا جا سکتا ہے ۔خاص طور پر فکشن پر تنقید کے اتنے واضح عملی نمونے ہمیں منٹو کے ہاں پہلی بار نظر آتے ہیں ۔فن پاروں کے تجزیے اور اُن کی پرکھ سے منٹو کی تنقیدی بصیرت کا شدید احساس ہوتا ہے ۔''(۲۷)

ڈاکٹر اسد فیض نے منٹو کا وہ تنقیدی دیباچہ بھی یہاں شامل کر لیا ہے جو انھوں نے سنسکرت شاعر دامودر گپت کی مشہور کتاب '' نٹنی متم '' کے اُردو ترجمہ '' نگار خانہ '' کے لیے لکھا تھا۔ اس کا ترجمہ اپنے وقت کے مشہور اُردوشاعر میرا جی نے کیا تھا۔ یہ دیباچہ نایاب یا گم شدہ تو نہیں تھا کیوں کہ حال ہی میں یہ کتاب ''نگار خانہ''، لاہور کے ادارہ بُک ہوم سے شائع ہوئی ہے ،منٹو کا یہ دیباچہ اسی میں شامل ہے ۔(۲۸)لیکن یہ دیباچہ ابھی تک غیر مدّون ضرور تھا ۔ لہٰذا ڈاکٹر اسد فیض نے اسے اپنی اس کتاب میں شامل کر کے محفوظ کر لیا ہے جو نہایت خوش آئند ہے ۔ یہاں سعادت حسن منٹو کا تاریخی شعور اور انسانی نفسیات کا علم ، ہر دو کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے ۔ لکھتے ہیں :

'' از منہ عتیق کی کوئی رنڈی جب کسی مرد کو پھانسنے کی کوشش کرتی ہو گی تو اس کے طریقے وہی ہوں گے جو آج کی رنڈی کے ہیں ۔ اس لیے کہ مرد نے جنسی لحاظ سے کوئی انقلاب انگیز ترقی نہیں کی ۔ معدے اور جنس کے معاملے میں جیسا وہ پہلے تھا، اب بھی ویسا ہی ہے ۔'' (۲۹)

ڈاکٹر اسد فیض نے سعادت حسن منٹو کے اس تنقیدی دیباچہ کے ساتھ ساتھ ایک تنقیدی مضمون ''اشتراکی شاعری'' کو بھی دریافت کر کے ہمارے لیے پیش کر دیا ہے ۔یہ مضمون انہوں نے ماہنامہ'' شاعر'' آگرہ کے ۱۹۳۷ء کے سالنامہ سے حاصل کیا ہے ۔ یہ وہی زمانہ ہے جب منٹو سوویت شاعری اور ادب سے متاثر تھے اور روسی ادبا کے تراجم بھی کر رہے تھے اور اُن کی تخلیقات پر اپنا اظہارِ خیال بھی ۔ اس مضمون سے بھی واضح ہے کہ سعادت حسن منٹو روس کے اشتراکی شعرا اور ادبا سے بہت متاثر ہیں ۔ وہ اُن کی دل کھول کر تعریف کرتے ہیں ۔ اُن کی شاعری کا تجزیہ کر کے اشتراکی شاعری کی اہمیت اور افادیت کا احساس دلاتے ہیں۔ اُن کے یہ الفاظ غور طلب ہیں جہاں لہجے میں تیقن کا انداز بھی موجود ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''سوویت ادبا نے اپنے ملک کی اشتراکی تشکیل میں بیش از بیش حصہ لیا ہے اور انسانی ارواح کو بیدار کرنے کے لیے وہ وہ کام انجام دیے ہیں جن کی مثال ملنی مشکل ہے ۔ قدیم اور فرسودہ تخیل کی عمارت ڈھا کر نئ دیواریں کھڑی کرنا سوویٹ روس کے انشا پردازوں کا کام ہے ، جس کو انہوں نے بڑے سلیقے سے انجام دیا۔'' (۳۰)

بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے منٹو روس کے اشتمالی شاعر دی لگوسکی کے مندرجہ ذیل اشعار کو روس کی اشتراکی شاعری کا دیباچہ قرار دیتے ہیں ۔ ان اشعار کا ترجمہ یقیناً سعادت حسن منٹو کا ہی ہے ۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

''میری شاعری ، میری شاعری
لڑائی کے میدان میں مارنے اور جلادینے کے لیے ہے
زندگی کی مضبوط کلیت ہٹا کر
اس کے حقیقی معانی فاش کرنے کے لیے ہے
حوادث و واقعات کے اسرار میں اصرار کر کے

بہرے کو سماعت اور گونگے کو گویائی عطا کرنا چاہتی ہے
کہ وہ قدرت کے قوانین جان سکیں‘‘(۳۱)

اس مضمون سے صاف ظاہر ہے کہ سعادت حسن منٹو ابتدائی برسوں میں بلاشبہ اشتراکیت سے اور روسی اشتراکی ادبا سے بے حد متاثر تھے اور خود بھی اچھے خاصے اشتراکی تھے اور اپنے ان نظریات کی پیش کش میں کافی حد تک جذباتی بھی تھے ۔

ڈاکٹر اسد فیض نے سعادت حسن منٹو کی جہاں اس قدر اہم تحریریں اپنے قارئین کے لیے پیش کی ہیں، وہاں ایک جاپانی شاعر بونی لیوگوشی کی نظموں کے نثری تراجم بھی ڈھونڈ نکالے ہیں ۔منٹو کے شعری تراجم یوں بھی کم ہیں اور اب تک جو تراجم دریافت ہوئے تھے وہ روسی یا فرانسیسی ادب سے متعلق تھے۔ جاپانی شاعری کے ان تراجم نے ہمیں واقعی حیرت میں ڈال دیا کہ سعادت حسن منٹو کی رسائی جاپانی ادب تک بھی تھی۔ اس ضمن میں ایم ۔ خالد فیاض کا یہ کہنا بالکل بجا ہے ، وہ لکھتے ہیں :

’’یہاں میں بہ طورِ خاص جاپانی شاعر بونی لیوگوشی کی نظموں کے منٹو کے نثری تراجم کا ذکر کروں گا۔ ڈاکٹر اسد فیض کی اس تحقے نے ہمارے اس عمومی تاثر کو زائل کیا ہے کہ منٹو کو صرف روسی اور فرانسیسی تراجم ہی سے سروکار رہا ہے ۔منٹو کے ان جاپانی نظموں کے تراجم سامنے آنے پر اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ منٹو صرف روسی اور فرانسیسی زبانوں کے ادب تک محدود نہیں تھے ، بلکہ وہ دیگر زبانوں کے ادب سے بھی مقدور بھر آگاہی رکھتے تھے ۔‘‘(۳۲)

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حیرت ہوتی ہے کہ منٹو نثری نظم کی فارم سے آگاہ تھے۔ عام طور پر اُردو میں نثری نظم کو ۱۹۶۰ء کے بعد کا واقعہ قرار دیا جاتا ہے مگر منٹو کے یہ تراجم بتاتے ہیں کہ منٹو اس سے بہ خوبی آگاہ بھی تھے اور اس صنف کو برتنے کا ملکہ بھی رکھتے تھے ۔ اسی لیے انہوں نے بونی لیوگوشی کی پانچ نظموں کے انتہائی خوب صورت تراجم کر دیے۔ اگرچہ سعادت حسن منٹو نے نگار خانہ کے دیباچہ میں صاف صاف لکھا کہ

’’مجھے شاعری سے کوئی شغف نہیں ۔‘‘(۳۳)اور’’ شعر وشاعری کے بارے میں میرا علم محدود ہے‘‘(۳۴)مگر ان کے شعری تراجم پڑھتے ہوئے اسے اُن کا انکسار ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان تراجم کے ہوتے ہوئے ہم یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ منٹو کو شاعری کا شغف نہیں تھا یا اس بارے میں اُن کا علم محدود تھا۔ آپ خود بھی دیکھ سکتے ہیں ۔ بونی لیوگوشی کی جن پانچ نظموں کا انہوں نے ترجمہ کیا ہے ان میں سے یہ ایک ترجمہ نمونے کے طور پر پیشِ خدمت ہے جس سے یہ فیصلہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے کہ سعادت حسن منٹو کی شعری صلاحیت کس قدر زیادہ تھی اور وہ اس کے اسرار و رموز سے بھی کس قدر آگاہ تھے ۔ ترجمہ دیکھیے :

’’تو کیا سوچ رہی ہے
تیری آنکھیں گھنی پلکوں سے کس کو دیکھ رہی ہیں ؟
لوگ تجھے موت کی نقاب کہیں ، لیکن
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو دن میں کئی مرتبہ مرتی ہے
دیکھو!اب تم مردہ ہو ، لیکن جب موت حیات میں تبدیل ہو جائے
دیکھو!دیکھو! شاید وہ ہونٹ متحرک ہو جائیں
ترے چہرے پر زندگی اور موت لا تعداد لہریں ثبت کرتی ہے
گویا خاموشی اور صدا کا تانا بانا نور وظلمات کا منقش کپڑا بن دیتا ہے
ترے رخسار اس قدر زرد کیوں ہیں ؟
مگر یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں اس لیے کہ تو نے تیس سال تک
خون کی شاعری کی ہے
میں تیری پیشانی کو دیکھتا ہوں اورمحسوس کرتا ہوں کہ میں
کسی ایسے آتش فشاں پہاڑ کو دیکھ رہا ہوں جو عین قریب
اپنے حلق سے شعلے اگلنے والا ہے
نہ معلوم یہاں کون سا جذبہ اور خیال تڑپ رہا ہے‘‘(۳۵)

اس کتاب کا دوسرا حصہ کتاب کے عنوان پر ہی ہے یعنی ’’ منٹو کی گمشدہ تحریریں‘‘۔ اس میں منٹو کے

چار افسانے :

(۱) پگلا (۲) بلا عنوان (۳) حماقت (۴) کوئلے

شامل ہیں ۔ یہ منٹو کے ایسے افسانوں کے متون ہیں جو بعد میں یا پہلے منٹو کے افسانوی مجموعوں میں دوسرے عنوانات کے تحت شامل ہوئے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اسد فیض کی وضاحت جو ان کی تحقیق کا نچوڑ ہے ، سن لیجیے: وہ لکھتے ہیں :

''گم شدہ تحریروں میں 'پگلا' سعادت حسن منٹو کا ایک افسانہ ہے۔ یہ بعد میں نام بدل کر انہوں نے 'نعرہ' کے نام سے اپنے افسانوں کے مجموعہ 'منٹو کے افسانے' مطبوعہ ۱۹۴۰ء میں شامل کیا 'پگلا' ہمایوں میں دسمبر ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۴۸ء کے نقوش شمارہ ۴، جشنِ آزادی نمبر میں منٹو کا ایک افسانہ 'بلا عنوان' صفحہ ۱۳۳ سے ۱۴۰ تک شائع ہوا ہے۔اس کے عنوان کو تجویز کرنے کا کام قارئین نقوش پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ بعد میں یہ منٹو کے افسانوی مجموعے 'نمرود کی خدائی' مطبوعہ ۱۹۵۰ء 'ڈارلنگ' کے عنوان سے شاملِ اشاعت ہے۔نقوش کے شمارہ نومبر/ دسمبر ۱۹۵۳ء میں ص ۱۷۱ تا ۱۷۴ میں منٹو کا ایک افسانہ 'حماقت' کے عنوان سے شاملِ اشاعت ہے جو ان کے افسانوی مجموعہ 'رتی ماشہ تولہ' مطبوعہ ۱۹۵۶ء میں 'نفسیات شناس' کے نام سے موجود ہے۔ اس کتاب میں منٹو کا ایک فیچر 'کوئلے' بھی شامل ہے۔ یہ آذر ذوبی کے پرچہ 'شعور' کراچی چھٹا شمارہ ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ یہ اس سے قبل 'منٹو ڈرامے' مطبوعہ ۱۹۴۴ء میں 'نیلی رگیں' کے نام سے شائع ہو چکا تھا۔ ان گم شدہ تحریروں کی اپنی اہمیت ہے کہ یہ اب ان ناموں سے منٹو کی کتابوں میں شامل نہیں۔''(۳۶)

واقعی ان متون کی اہمیت ہے کیوں کہ یہ ہمیں بتاتے ہیں کہ سعادت حسن منٹو کے ہاں بہت سے متن

دو دوعنوانات سے ملتے ہیں ۔ یہ بات افسانے اور خاص طور پر منٹو کے محققین کے لیے انتہائی دلچسپی کا سامان رکھتی ہے۔

تیسرا حصہ'' منٹو شناسی'' کے عنوان سے ہے ۔ جس مین منٹو کے حوالے سے تین مضامین ڈاکٹر اسد فیض کے شامل ہیں اور چار شاعروں کی منٹو پر لکھی گئی پانچ اہم نظمیں اس حصہ کو معتبر بناتی ہیں ۔

ڈاکٹر اسد فیض کا پہلا مضمون'' منٹو اور رسالہ ہمایوں''کے عنوان سے ہے ۔ اس مضمون میں رسالہ ہمایوں کی اہمیت اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ منٹو اور ہمایوں کے ساتھ کا تفصیلی ذکر موجود ہے ۔ ہمایوں نے بالخصوص جو'' روسی ادب نمبر'' اور'' فرانسیسی ادب نمبر'' شائع کیے تھے اور جن میں سعادت حسن منٹو کا اہم کردار تھا، اُن کا تفصیلی ذکر ہے کہ منٹو نے کس طرح '' ہمایوں'' کے مدیر حامد علی خان کی معاونت کی ۔ ان کے علاوہ کن کن شماروں مین منٹو کی دیگر تحریریں شائع ہوئیں ۔ ڈاکٹر اسد فیض ایک حوالے سے'' ہمایوں'' کا اُردو زبان و ادب پر بہت احسان مانتے ہیں ۔ لکھتے ہیں :

> '' رسالہ ہمایوں اور اس کے ایڈیٹر حامد علی خان کا یہ اُردو افسانے پر احسان ہے اگر وہ نو عمر منٹو کی حوصلہ افزائی نہ کرتے تو اُردو زبان اس عہد ساز ادیب سے محروم رہ جاتی اور ایک خاص دور کی معاشرت اور اس کی حقیقی تصویر ہماری نظروں سے اوجھل رہتی ۔ ہمایوں کے یہ اوراق ایک بڑ ے ادیب کے ابتدائی دور کی ان کہی کہانی بھی ہمیں سناتے ہیں۔ جس میں اس کی پسند ، دلچسپی اس کے ابتدائی رویوں کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے ۔''(۳۷)

اس مضمون میں ڈاکٹر اسد فیض نے منٹو کے ابتدائی دور پر دیگر ادیبوں کے اثرات کی بھی نشان دہی کی ہے۔خاص طور پر جریکوف ، گورکی اور باری علیگ کے واضح اثرات منٹو کی ابتدائی تحریروں میں نظر آتے ہیں ۔ مثلاً ڈاکٹر اسد فیض کا یہ کہنا بڑا غور طلب ہے کہ :

> '' اس (منٹو) کا پہلا طبع زاد افسانہ تماشا دراصل جریکوف کے افسانے

جادوگر سے اخذ شدہ ہے۔۔۔۔ اس میں سرگ اور تماشا کے بنیادی کردار خالد میں بے حد مماثلت ہے بلکہ کئی جملے بھی مکمل صورت میں ایک جیسے ہیں ۔۔۔۔ ہمایوں کے روسی ادب نمبر میں منٹو کے مضمون روسی ادب پر ایک طائرانہ نظر کی ابتدائی سطور باری علیگ کے اس مضمون کا ابتدائیہ ہے ، جو منٹو کی کتاب '' روسی افسانے '' میں دیباچہ کے طور پر شائع ہوا ہے ۔''(۳۸)

دوسرا مضمون ڈاکٹر اسد فیض نے ''رسالہ عالمگیر کا ایک یادگار شمارہ'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے ۔ اس میں اگرچہ انہوں نے '' عالمگیر'' کا تفصیلی تعارف بھی کرایا ہے اور اس کی ادبی اہمیت سے بھی آ گاہ کیا ہے مگر اصل موضوع عالمگیر کے اس روسی ادب نمبر کو بنایا ہے جو اپریل ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا ۔ اس نمبر کی خاص بات بھی یہ تھی کہ اسے سعادت حسن منٹو نے مرتب کیا تھا۔ اس میں منٹو کا بھر پور قلمی تعاون شامل تھا۔ اُن کے بیشتر تراجم سے یہ نمبر مزین تھا ۔حتیٰ کہ منٹو نے روسی شعرا کے شاعرانہ تراجم بھی کیے تھے ۔ عالمگیر اور ہمایوں کے روسی ادب نمبروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں دوستووسکی ، طالسٹائی ، پوشکن ، چیخوف اور گورکی زیادہ شہرت رکھتے تھے۔ کیوں کہ ہمارے ادیبوں نے انہی روسی ادبا کی تخلیقات کے زیادہ تراجم کیے اور وہ اس لیے کہ ان ادیبوں کے پیش کیے گئے ادب میں، اور ہندوستانی حالات میں، کافی مماثلت موجود تھی۔ بہر حال سعادت حسن منٹو کے حوالے سے '' عالمگیر'' اور '' ہمایوں'' کے روسی اور فرانسیسی ادب نمبروں کی خاص اہمیت ہے ۔ ڈاکٹر اسد فیض کے اس کہے کو جھٹلانا ممکن نہیں ۔ انہوں نے بجا لکھا ہے کہ :

''ناقدین کی رائے میں منٹو کے افسانوں کا گہرا اور جامع مطالعہ کرنے کے لیے ہمایوں اور عالمگیر کے روسی ادب اور فرانسیسی ادب کا مطالعہ از حد ضروری ہے ۔ اس نے ان تراجم کے توسط سے افسانے لکھنے کے روسی اور فرانسیسی انداز کو اپنایا یہی نکتہ اس کے منفرد اسلوب ، مشاہدے کی گہرائی ، جزئیات نگاری اور کردار آفرینی کی بنیاد بنا ہے ۔''(۳۹)

اس کے بعد ڈاکٹر اسد فیض نے ''منٹو کی چار نادر تحریریں'' کے عنوان سے منٹو کی چار نادر تحریروں کو موضوع بنایا ہے ۔ ان تحریروں کا تعارف اور تفصیلات پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ منٹو کی ذاتی اور ادبی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو آشکار کیا جا سکے ۔

ان میں پہلی تحریر ایک خط ہے جو منٹو نے ۱۷ جنوری ۱۹۵۵ء کو رفیق چوہدری کی درخواست پر مہدی علی صدیقی کے نام لکھا تھا۔ اس سے اگلے روز منٹو کا انتقال ہو گیا تھا۔ لہٰذا بقول ڈاکٹر اسد فیض '' اس لحاظ سے یہ منٹو کی آخری تحریر ہے ۔'' (۴۰)ڈاکٹر اسد فیض نے یہاں اس خط کا اصل متن شامل مضمون بھی کیا ہے۔

دوسری تحریر '' حمید اور حمیدہ'' کے نام سے تمثیل کا تفصیلی وضاحتی ذکر ہے جس پر ہم گزشتہ اوراق میں بھی بات کر آئے ہیں ۔ یہاں وہ تنقیدی رائے اہم ہے جو ڈاکٹر اسد فیض نے اس تمثیل کے ذیل میں منٹو کے حوالے سے رقم کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

> '' اس تمثیل میں صاف نظر آتا ہے کہ زبان اور محاورے پر منٹو کو خوب عبور حاصل ہے حتیٰ کہ کردار کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے وہ اس کے باطن میں اتر کر اصل کردار میں ڈھل گیا ہے۔''(۴۱)

تیسری تحریر منٹو کا افسانہ '' پگلا'' ہے جو ہمایوں کی دسمبر ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں شامل تھی مگر بعد میں منٹو نے اس کا عنوان بدل کر '' نعرہ'' کے عنوان سے اپنے افسانوں کے مجموعہ میں شامل کیا۔ ڈاکٹر اسد فیض کے بقول '' یہ افسانہ منٹو کی ذاتی زندگی کے ایک حقیقی واقعہ پر مبنی ہے۔''(۴۲)

چوتھی تحریر وہ ہے جو '' غالبؔ کی وضعداری'' کے عنوان سے شیرازہ کی ایک اشاعت میں پہلے شائع ہوئی مگر بعد میں اسی موضوع پر مبنی '' غالبؔ اور سرکاری ملازمت'' کے عنوان سے ملتی ہے مگر ان دونوں تحریروں کا متن مختلف ہے اور ڈاکٹر اسد فیض کا یہ دعویٰ ہے کہ '' کتاب منٹو ڈرامے میں شامل ڈرامہ غالبؔ اور سرکاری ملازمت سے شیرازہ میں شائع شدہ ڈرامہ بدرجہا بہتر اور فنی اعتبار سے مکمل ہے ۔''(۴۳)

اس کتاب کے آخر میں چار شاعروں سید فیضی ، مجید امجد، خاطر غزنوی اور راجہ مہدی علی خان کی منٹو

پر لکھی گئی پانچ نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ منٹو پر کئی شاعروں نے کئی نظمیں اور غزلیں خلق کیں۔ ڈاکٹر طارق ہاشمی اس ضمن میں اپنے ایک مضمون '' اُردو شاعری میں تحسین منٹو'' میں لکھتے ہیں :

'منٹو پر لکھی گئی یہ نظمیں ایسے شخصی خاکے ہیں جن میں موضوع کے خدوخال کے اندر اس کے ماحول کی بھی پوری تصویر نظر آتی ہے ۔ان نظموں کو مجموعی طور پر دیکھیں تو یہ قدرِ مشترک نظر آتی ہے کہ شعرا نے مظاہرِ حیات اور اقدارِ زندگی کو کم و بیش ویسے ہی طنز کا ہدف بنایا ہے جو منٹو کے افسانوں کا بنیادی موضوع ہے اور ان نظموں میں اُسی غصے کا تسلسل دکھائی دیتا ہے جو ان کی کہانیوں کے خمیر میں پایا جاتا ہے۔''(۴۴)

سید فیضی نے اپنی نظم ''منٹو'' میں سعادت حسن منٹو کی شخصیت جراحی کو موضوع بنایا ہے اور ایک سچا حقیقت نگار قرار دیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ منٹو نے کس قسم کی زندگی اپنے افسانوں میں پیش کی ہے۔ اور آخر میں منٹو کو جس خوب صورت انداز سے خراج تحسین پیش کیا ہے وہ بہت کمال ہے جس میں خلوص اور حقیقت کا امتزاج بہت عمدہ ہے۔ کہتے ہیں:

ایک نغمہ تھا جسے سیکڑوں عنوان ملے
کب سے مضراب طلب زیست کا یہ ساز بھی تھا
اس کے ہر پردے میں افسانے پریشان ملے
منٹو خود وقت بھی تھا، وقت کی آواز بھی تھا(۴۵)

مجید امجد کی نظم ''منٹو'' تو شاہکار مانی جاتی ہے۔ ایسی نظم شاید ہی منٹو پر کوئی اور لکھ سکے۔ اسرار زیدی کے الفاظ میں'' اسے بلاشک و شبہ سعادت حسن منٹو کے ایک خوب صورت اور مکمل شعری خاکے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، جس کی مثال پوری اُردو شاعری میں ملنا مشکل ہوگی۔''(۴۶) مجید امجد نے اس نظم میں جس صناعی

سے کام لیا ہے اُس کی بنیاد پر منٹو کا کردار اور شخصیت پوری طرح اس نظم میں سموئی گئی ہے۔ اس نظم کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۵۲ء کے لگ بھگ منٹو نے اپنے بارے میں ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور دیگر اپنی جان پہچان کے لوگوں کے ذاتی تاثرات اور آرا پر مشتمل ایک مجموعہ بعنوان ''ناخن کا قرض'' مرتب کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اسی سلسلے میں منٹو نے دوسرے ادیبوں کے ساتھ ساتھ مجید امجد کو بھی اپنے منصوبہ سے آگاہ کیا اور ایک خط لکھا جس میں کہا کہ:

> ''فوراً قلم اُٹھایئے اور نظم یا نثر میں میرے بارے میں جو Impressions آپ کے دماغ میں آئیں کاغذ پر منتقل کر دیجیے۔ یہ فوری طور پر ہونا چاہیے۔۔۔ میں واپسی ڈاک میں آپ کے Impressions کا منتظر رہوں گا۔''(۴۷)

مجید امجد نے اسی ارشاد کی تعمیل میں یہ نظم تخلیق کی جو منٹو پر لکھی جانے والی سب نظموں پر بازی لے گئی۔ باوجود اس کے کہ مجید امجد افسانہ نگار نہیں تھے اور اُن کے اور منٹو کے میدان یک سر الگ الگ تھے مگر ایسا لگتا ہے کہ جیسے مجید امجد صرف منٹو کے ہی نہیں منٹو کے افسانوں کی گہرائیوں میں بھی بڑی دور تک اُتر گئے۔ سولہ مصرعوں پر مبنی یہ مختصر آزاد نظم منٹو کا ایسا اسکیچ کھینچ ڈالتی ہے کہ دماغ دنگ رہ جاتا ہے۔ نظم کا آخری حصہ دیکھیے کہ جہاں اظہار اپنی انتہاؤں پہ پہنچ رہا ہے۔ بقول مجید امجد:

انگاروں بھری آنکھوں میں یہ تند سوال
کون ہے یہ جس نے اپنی بہکی بہکی سانسوں کا جال
بامِ زماں پر پھینکا ہے؟
کون ہے جو بل کھاتے ضمیروں کے، پر پیچ دھندلکوں میں
روحوں کے عفریت کدوں کے زہر اندوز محلکوں میں
لے آیا ہے، یوں بن پوچھے، اپنے آپ،
عینک کے برفیلے شیشوں سے چھنتی نظروں کی چاپ؟

کون ہے یہ گستاخ؟
تاخ،تڑاخ(۴۸)

خاطر غزنوی کی نظم ''سعادت حسن منٹو'' اگرچہ اُس پایے کی نہیں مگر کچھ حقیقتیں اُس میں بھی اجاگر ہوئی ہیں جو قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں ایک خاص تکنیک سے منٹو کو ایک خیال، ایک بہار، ایک چراغ، ایک کتاب، ایک سرور اور ایک خمار کہا گیا ہے۔ مثلاً چراغ اور کتاب کے حوالے سے دیکھیے:

منٹو ایک چراغ
پھیلی ضو میں لو دیتے ہیں ہر دامن کے داغ
منٹو ایک چراغ

منٹو ایک کتاب
تلخ حقائق، ترش فسانے، شیریں شیریں باب
منٹو ایک کتاب(۴۹)

راجہ مہدی علی خان کی ڈاکٹر اسد فیض نے یہاں دو نظمیں شامل کی ہیں؛ ایک ''منٹو حباب اندر'' اور دوسری ''غالب منٹو کے گھر میں''۔ پہلی نظم میں بقول مسعود اشعر ''منٹو وہی تھا جو راجہ مہدی علی خان نے اپنی نظم میں دکھایا ہے۔ سب سے الگ، سب سے منفرد۔''(۵۰) اپنی الگ سوچ رکھنے والا حتیٰ کہ چونکانے والا اور جھنجھوڑنے والا۔ اگرچہ نظم کا انداز ذرا مزاحیہ ہے مگر اُس میں منٹو کی تصویرِ اصل بنی ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

اُلو رات کو سو جاتے ہیں
طوطے گلابی ہو جاتے ہیں

افلاطون کی چھ مائیں تھیں
کچھ بھینسیں تھیں کچھ گائیں تھیں

چور کو چوری سے مت روکو
شعر کہے شاعر تو ٹوکو

توبہ کتنا نیک ہے شیطان
دبلا ہے راجہ مہدی علی خان(۵۱)

''غالب منٹو کے گھر میں'' غالب اور منٹو کا منظوم مکالمہ ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ غالب؛ منٹو کے ہاں مہمان ہوئے ہیں اور منٹو اپنی میزبانی کے فرائض نبھاتے نظر آتے ہیں۔ یہاں بھی انداز طنزیہ اور کسی قدر مزاحیہ ہے مگر غالب اور منٹو کے مشترکہ درد کی عکاسی کر گیا ہے۔ غالب جب منٹو کو احساس دلاتے ہیں کہ میں تمہارا مہمان ہوں کچھ خاطر داری کا سوچو اور منٹو دریافت کر لیتے ہیں کہ غالب اب بھی پیتے ہیں اور وہ شراب منگا لیتے ہیں اور دونوں پی جاتے ہیں تو آخر میں منٹو یہ کہتے ہیں کہ:

منٹو: آؤ نشے میں روئیں وہ نالے کریں اسدؔ
جن نالوں سے شگاف پڑے آفتاب میں(۵۲)

غرض یہ کہ ڈاکٹر اسد فیض نے واقعی یہاں ایسی نظموں کا انتخاب بطور خاص منٹو کے عاشقین کے لیے پیش کیا ہے کہ بقول ایم۔ خالد فیاض جن ''سے منٹو کے شخصی اور فکری خطّ و خال مرتب ہوتے ہیں''(۵۳)اسی لیے ڈاکٹر اسد فیض کی اس کتاب کو بہترین کتاب کہا جا رہا ہے بلکہ بقول حمیرا اطہر ''منٹو کی گم شدہ تحریریں' منٹو کی رنگا رنگ تحریروں سے سجی ہے۔''(۵۴) اور اس میں کوئی شک نہیں۔

اب سوال صرف یہ پیدا ہوتا ہے کہ منٹو پر اتنی نظمیں لکھی گئی ہیں جن کا تفصیلی ذکر ڈاکٹر طارق محمود ہاشمی کے مضمون میں ملتا ہے، تو ڈاکٹر اسد فیض نے یہاں اس کتاب میں صرف انہی پانچ نظموں ہی کو کیوں

شامل کیا؟ دیگر کو کیوں نہیں؟ کیوں کہ غیر مدّون تو دیگر نظمیں بھی تھیں۔ اس سوال کا جواب ہمیں ڈاکٹر اسد فیض کے ہاں نہیں ملتا۔ قیاس ہے کہ ان نظموں کو شاید اُنہوں نے زیادہ بہتر سمجھا ہوگا۔

حوالہ جات

۱۔محمود احمد قاضی : '' نایاب منٹو'' ،مشمولہ '' منٹو : کون ہے یہ گستاخ۔۔۔؟''، مرتب : ڈاکٹر سید عامر سہیل ، لاہور، پاکستان رائٹرز کواپریٹو سوسائٹی ،۲۰۱۵ء،ص:۱۵۰

۲۔دیکھیے : منٹو، سعادت حسن : '' منٹو باقیات'' ،لاہور ، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء،ص ۱ تا ۳

۳۔خالد ارمان : (مرتب):'' باقیاتِ منٹو'' لاہور ، نگارشات ،۲۰۰۶ء،ص:۱۵ تا ۱۶

۴۔ایم ۔خالد فیاض:'' نوارداتِ منٹو:ایک مطالعہ''،مشمولہ سہ ماہی ''سمبل''، راولپنڈی، جلد :۵، شمارہ :۱ تا ۴، جولائی ۲۰۱۰، تاجون ۲۰۱۱ء،ص:۳۳۷

۵۔دیکھیے : منٹو، سعادت حسن : '' منٹو کہانیاں''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز : ۲۰۰۴ء،ص : ۵

۶۔اسد فیض، ڈاکٹر:(مرتب)،'' منٹو کی گم شدہ تحریریں'' کراچی ،ظفر اکیڈمی ،۲۰۱۴ء،ص:۹ تا ۱۰

۷۔ایضاً ، ص: ۱۰

۸۔ایم ۔ خالد فیاض : '' منٹو کی گم شدہ تحریریں''،مشمولہ :'' زیست'' ، کراچی ، شمارہ نمبر ۸،مئی ،جون ۲۰۱۵ء،ص:۳۷۹

۹۔سجاد حارث:'' ادب اور ریڈیکل جدیدیت''، لاہور، نگارشات ، ۱۹۸۸ء،ص:۱۷۴

۱۰۔دیکھیے محمد سعید : (مرتب)،'' نوادراتِ منٹو''، لاہور، ادارہ فروغ مطالعہ ، ۲۰۰۹ء،

۱۱۔ دیکھیے احمد سلیم : (مرتب)،'' روسی ادب کے شاہکار''، ترجمہ : سعادت حسن منٹو ، لاہور ، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۱۲۔دیکھیے ابو بکر فاروقی ، محمد : (مرتب)''انتون چیخوف:افسانے، ڈارامے اور تنقیدی مطالعے''، کراچی، ٹِک ٹائم ، ۲۰۱۵،ص: ۹۴ تا ۱۰۳

۱۳۔محمد مجیب : '' روسی ادب'' (جلد دوم)، کراچی ، انجمن ترقیٔ اُردو، پاکستان ،۱۹۹۲ء،ص:۲۹۵

۱۴۔دیکھیے : محمد سعید: ''سعادت حسن منٹو کا ایک نادر و نایاب ترجمہ''، مشمولہ ''زیست''(منٹو صدی

نمبر)، کراچی ، شمارہ نمبر۴، نومبر۲۰۱۲ء، ص:۱۴۵

۱۵۔ایضاً،   ص: ۱۴۴

۱۶۔''نوادراتِ منٹو''،ص:۱۷۵

۱۷۔ہمارے ایک نامور نقاد اور افسانہ نگار پرویز انجم نے منٹو پر ایک کتاب ترتیب دی ہے جس میں انہوں نے منٹو کو غالبؔ کا پرستار ثابت کیا ہے ۔ (دیکھیے: '' منٹو ۔غالبؔ کا پرستار''،فیصل آباد، مثال پبلشرز،۲۰۱۲ء) جب کہ اس حوالے سے ایم ۔ خالد فیاض نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ'' منٹو عزت کر سکتے ہیں ، احترام کر سکتے ہیں لیکن وہ کسی کے پرستار بھی ہو سکتے ہیں یہ بات حلق سے نہیں اترتی ۔منٹو بلا شبہ غالبؔ کی عظمت کے قائل تھے لہٰذا انہوں نے اپنی تحریروں میں غالبؔ کو موضوع بنایا ۔ اس لیے ہم منٹو کو غالبؔ پسند تو کہہ سکتے ہیں لیکن پرستار ۔۔۔؟ یہ ایک سوال رہے گا۔'' (دیکھیے :''تناظر'' ، گجرات ، شمارہ نمبر۲، جولائی تا دسمبر۲۰۱۲ء،ص: ۴۰۲)

۱۸۔انتظار حسین : '' منٹو کی گم شدہ تحریریں''، مشمولہ روزنامہ ایکسپریس، اسلام آباد ،۲۱ نومبر۲۰۱۴ء، ص: ۸

۱۹۔ دیکھیے پرویز انجم : '' منٹو۔غالبؔ کا پرستار''،ص:۷۶

۲۰۔اسد فیض ، ڈاکٹر،'' منٹو کا ایک گمشدہ افسانہ''،مشمولہ'' تناظر ، گجرات ، شمارہ نمبر۲، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۲،ص: ۳۸۲ تا ۳۸۳

۲۱۔خالد اشرف ،ڈاکٹر: '' افسانے منٹو کے اور پھر بیاں اپنا''، لاہور ، دستاویز،۲۰۱۳ء،ص: ۲۰۴

۲۲۔طاہرہ اقبال، ڈاکٹر: ''منٹو کا اسلوب: افسانوں کے حوالے سے''، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء، ص:۲۹۰

۲۳۔منٹو، سعادت حسن:'' منٹو ڈرامے'' ، لاہور ، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳،ص:۲۶۵

۲۴۔ممتاز شیریں : '' منٹو : نوری نہ ناری''، کراچی ، مکتبۂ اسلوب،۱۹۸۵ء،ص ۱۶۴

۲۵۔وارث علوی : '' منٹو : ایک مطالعہ''، اسلام آباد ،الحمرا،۲۰۰۳،ص:۳۰

۲۶۔مبین مرزا: '' سعادت حسن منٹو: شخصیت اور فن''، اسلام آباد ، اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۸ء، ص:۱۱۷

۲۷۔ایم ۔ خالد فیاض : '' مغربی ادب اور منٹو کی تنقیدی نظر''، مشمولہ'' زیست''(منٹو صدی نمبر)،

کراچی ،ص:۲۱٦

۲۸۔دیکھیے : دامورگپت:''نگار خانہ''،مترجم : میرا جی ، لاہور ، بک ہوم ،۲۰۰۴ء،ص:۵ تا ۸

۲۹۔منٹو ، سعادت حسن : ''دیباچہ/نگار خانہ'' مشمولہ : '' منٹو کی گمشدہ تحریریں''،ص : ۱۴۸

۳۰۔ایضاً،'' اشترا کی شاعری''،مشمولہ : ایضاً ،ص: ۱۵۵ تا ۱۵٦

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۵٦

۳۲۔ایم ۔خالد فیاض : ''منٹو کی گم شدہ تحریریں''،مشمولہ :''زیست''، شمارہ نمبر۸،ص:۳۷۹

۳۳۔''نگار خانہ''،ص:۵

۳۴۔ایضاً، ص:۸

۳۵۔منٹو کی گمشدہ تحریریں''،ص: ۱۵۱ تا ۱۵۲

۳٦۔ایضاً، ص۱۰ تا ۱۱

۳۷۔اسد فیض، ڈاکٹر : '' منٹو اور رسالہ ہمایوں''،مشمولہ : ایضاً،ص: ۲۰۰

۳۸۔ایضاً، ص:۲۰۰

۳۹۔ایضاً، ص:۲۰۴

۴۰۔ایضاً، ص:۲۰۷

۴۱۔ایضاً، ص:۲۱۰

۴۲۔ایضاً، ص:۲۱۱

۴۳۔ ایضاً، ص:۲۱۲

۴۴۔طارق ہاشمی ، ڈاکٹر: '' اُردو شاعری میں تحسین منٹو''،مشمولہ:''بنیاد''، لاہور، لمز، جلد نمبر ۷، ۲۰۱٦ء، ص:۳۲۷

۴۵۔''منٹو کی گمشدہ تحریریں''،ص: ۲۱٦

۴٦۔ اسرار زیدی: ''منٹو''، مشمولہ ''صورتِ معنی، معنیٔ صورت''، ترتیب و تہذیب: جنید امجد، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۴ء، ص: ۸۹

۴۷۔ منٹو، سعادت حسن: ''مجید امجد کے نام ایک خط''، مشمولہ ماہنامہ ''قند''، (مجید امجد نمبر)، مردان، جلد نمبر۳، شمارہ نمبر ۸۔۹، مئی جون ۱۹۷۵ء، ص:۱۲۲

۴۸۔''منٹو کی گمشدہ تحریریں''، ص: ۲۱۷

۴۹۔ایضاً، ص: ۲۱۸ تا ۲۱۹

۵۰۔مسعود اشعر: ''سب سے بڑی ہستی ہے شیطان''، مشمولہ ''منٹو کا آدمی نامہ''، ترتیب: آصف فرخی، کراچی، شہرزاد،۲۰۱۲ء، ص: ۱۶۷

۵۱۔''منٹو کی گمشدہ تحریریں''، ص: ۲۲۰

(نوٹ: مسعود اشعر نے اپنے مضمون میں اس نظم کے جو اشعار درج کیے ہیں اُن کا متن ڈاکٹر اسد فیض کے ہاں پیش کردہ نظم کے متن سے مختلف ہے۔)

۵۲۔''منٹو کی گمشدہ تحریریں''، ص: ۲۱۷

۵۳۔ایم۔خالد فیاض: ''منٹو کی گم شدہ تحریریں''، مشمولہ: ''زیست''، ص:۳۸۰

۵۴۔حمیرا اطہر: ''منٹو کی گم شدہ تحریریں''، مشمولہ روزنامہ ''جناح''، کراچی،۱۶ نومبر ۲۰۱۵، ص: ۱۱

باب چہارم:

اسد فیض کی دیگر تحقیقی اور تنقیدی کاوشیں

ڈاکٹر اسد فیض کی تحقیقی وتنقیدی کاوشوں کا دائرہ کافی وسیع ہے ۔ اقبال اور منٹو کے علاوہ انہوں نے مختلف موضوعات پر بھی تحقیقی مقالے لکھے جن کی ملک اور ملک سے باہر بڑی پذیرائی ہوئی ۔ اس کے علاوہ انہوں نے ’’ ہم عصر‘‘ اور ’’ سپوتنک‘‘ میں مدیرانہ صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہوئے اُن کے خصوصی نمبر مرتب کیے۔ علاوہ ازیں اُن کا ایک محبوب مشغلہ معروف ادیبوں اور شاعروں کے انٹرویو کرنا بھی ہے ۔ ہم یہاں اُن کی ایسی ہی کاوشوں کا باری باری مطالعہ کریں گے ۔

تحقیق میں اُن کی دلچسپی کا ایک میدان ادبی نوادرات کی دریافت ہے۔ اس ضمن میں اُن کا ایک تحقیقی مقالہ ’’ ادبی نوادرات ‘‘ انتہائی اہمیت کا حامل ہے ۔ اس مقالہ میں ڈاکٹر اسد فیض نے معاصر تخلیق کاروں کی ابتدائی تخلیقات کے نمونے ، جو انہوں نے قدیم ادبی جرائد سے انتہائی کدو کاوش سے حاصل کیے ، یہاں پیش کیے ہیں ۔ ان تخلیق کاروں میں ادا جعفری ، احمد ندیم قاسمی ، فیض احمد فیض اور وزیر آغا شامل ہیں ۔ ان بڑے تخلیق کاروں کی پہلی پہلی تخلیقی کاوشوں کو ڈاکٹر اسد فیض نے بڑی محنت سے ڈھونڈ نکالا اور صرف ڈھونڈ نہیں نکالا بلکہ انہیں ہمارے سامنے پیش بھی کر دیا۔ ادا جعفری کی اس ضمن میں ڈاکٹر اسد فیض نے دو تخلیقات پیش کی ہیں ، اور یہ دونوں نظمیں ہیں ۔ ایک ’’ تمنائیں‘‘ اور دوسری ’’ آہ وہ دن !‘‘۔ ان نظموں سے مستقبل میں سامنے آنے والی ادا جعفری جھلکتی ہیں ۔ مثلاً اُن کی نظم ’’آہ وہ دن!‘‘ سے یہ اشعار دیکھیے :

کہاں ہیں اب وہ دن جب محفلِ دل جگمگاتی تھی
ہمارے لب پہ آ آ کر مسرت مسکراتی تھی !

مرے ہمدم !وہ دن ، جب کیف صہبائے محبت سے
’کسی ‘ کی نرگسی شہلا مجھے بے خود بناتی تھی !

تو اب مجھ کو وہ لمحاتِ حسین کیوں یاد آتے ہیں ؟
ادا وہ قصہ ہائے دلنشیں کیوں یاد آتے ہیں ؟(۱)

احمد ندیم قاسمی کی بھی ایک نظم ''اختر شیرانی کے حضور میں !'' ایسی ہے جواختر شیرانی کے رسالہ ''رومان''میں شائع ہوئی تھی (۲) اس اور جو بعد میں قاسمی صاحب کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہو سکی تھی ۔ اس نظم کے آخری تین مصرعے ملاحظہ کیجیے جس میں احمد ندیم قاسمی کی مخصوص آواز سنائی دیتی ہے :

پگھل کر چاند کی کرنیں جہاں نہریں بناتی ہیں
اُسی جنت میں اک آشفتہ سر کی بھی رسائی ہو
مری آنکھوں میں تو اور میرے قدموں پر خدائی ہو!(۳)

اسی طرح فیض احمد فیضؔ کی ایک نظم ''افسردگی'' بھی ڈاکٹر اسد فیض کی اہم دریافت ہے جو فیضؔ کی کلیات میں شامل نہیں ۔ یہ نظم تو بالکل فیضؔ کے لہجے اور اسلوب کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اگرچہ انگریزی نظم کے اثرات بھی واضح ہیں مگر فیضؔ کا مخصوص لہجہ زیادہ **Overlap** کر رہا ہے اور حیرت ہے کہ فیضؔ نے اسے اپنے کلیات میں یا پہلے شعری مجموعہ میں شامل کیوں نہیں کیا۔ یوں بھی یہ کوئی اتنی نا پختہ یا بالکل نظر انداز کر دینے والی نظم دکھائی نہیں دیتی ۔ہم ڈاکٹر اسد فیضؔ کے احسان مند ہیں کہ اُن کی وجہ سے ہم فیضؔ کی اس تخلیق سے آگاہ ہو سکے ۔ یہ پوری نظم جو انتہائی مختصر ہے ملاحظہ کیجیے کہ اس میں سے چند مصرعے الگ کرنا نظم کے ساتھ زیادتی ہو گی ۔ دیکھیے :

''بام ودر خامشی کے بوجھ سے چُور
آسمانوں سے جوئے درد رواں
چاند کا دُکھ بھرا فسانۂ نور
شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
خواب گاہوں میں نیم تاریکی

مضمحل لے ربابِ ہستی کی
ہلکے ہلکے سروں میں نوحہ کناں''(۴)

ڈاکٹر وزیر آغا کی ایک غزل، جو اُس دور کی ہے جب وہ نصرت آرا نصرت کے نام سے لکھا کرتے تھے ، ڈاکٹر اسد فیض نے دریافت کی ہے۔ یہ بھی وزیر آغاز کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ۔ اس کا لب و لہجہ بعد کی وزیر آغا کی شاعری کے لب و لہجہ کے بہر حال مختلف دکھا ئی دیتا ہے ۔ اس میں سے چند اشعار بھی دیکھیے:

متاعِ زیست کا حاصل گنوا رہی ہوں میں
یہ کس کی راہ میں آنسو بہا رہی ہوں میں

خزاں میں چھیڑا ہے میں نے بہار کا نغمہ
دیا بجھا تھا اسے پھر جلا رہی ہوں میں

فلک پہ ایک بھی انجم نہیں رہا نصرت!
یہ کس کو غم کی کہانی سنا رہی ہوں میں (۵)

اسی طرح ڈاکٹر اسد فیض مشاہیر کے خطوط میں بھی بہت دلچسپی لیتے ہیں ۔ وہ گاہے گاہے انہیں مرتب کرتے رہتے ہیں اور ان پر حواشی بھی تیا ر کرتے ہیں جو خاص تحقیقی اور انتہائی محنت طلب کام ہے ۔ اُن کی نظر میں مشاہیر کے خطوط کی بڑی اہمیت ہے۔ اس ضمن میں اُن کا نقطہ منظر کیا ہے ، یہ جاننے کے لیے ذیل کا اقتباس دیکھئے:

''خطوط نویسی کا فن اب معدوم ہو رہا ہے ۔ نئے ذرائع اطلاعات جن میں موبائل فون اور کمپیوٹر سرِ فہرست ہیں ، خطوط کی ضرورت اور اہمیت کو قدرے کم کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود بھی لکھنا اور پڑھنا

ایک دل چسپ مشغلہ ہے ۔ یہ کئی اعتبار سے اطلاعات کی فراہمی اور قاری کی معلومات میں اضافہ کا باعث ہوتے ہیں۔ ادیبوں کے خطوط اُن کی ذات اورفن کے بارے میں آگہی کا اہم ذریعہ بھی ہیں۔''(۶)

ڈاکٹر اسد فیض چوں کہ پاک و ہند کے مشہور محقق ہیں اس لیے اُن کے پاکستان اور ہندوستان کے معروف ادیبوں سے رابطے ہیں اور ان رابطوں کا ذریعہ خط کتابت رہی ہے ۔ لہٰذا اُن کے پاس بہت سے نام ور ادیبوں کے نایاب خطوط کا ایک نایاب ذخیرہ موجود ہے جس میں سے وہ باری باری منتخب کردہ خطوط پیش کرتے ہیں ۔'' مشاہیر کے خطوط'' نامی اپنے ایک تحقیقی مقالے میں انہوں نے خلیق انجم اور وزیر آغا کے چند خطوط پیش کیے ہیں ۔

خطوط واقعی ادیبوں کی ذات ، اُن کی مجموعی شخصیت ، اُن کے نظریات اورفن پر روشنی ڈالنے کا اہم ذریعہ ہیں۔خلیق انجم کے خطوط اُن کی ذات اور شخصیت کے عکاس ہیں جو اُن کی جدت پر مائل شخصیت کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں ۔ ڈاکٹر اسد فیض کے نام خلیق انجم اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

''آپ نے اُردو فکشن کی وضاحتی فہرست کی فرمائش کی تھی ۔ میں نے آ کر بک شاپ سے معلوم کیا تو پتا چلا کہ اس کی دو یا تین جلدیں باقی ہیں اور یہ جلد یں انجمن کسی کونہیں دیتی ۔ میں نے ایک جلد کی زیروکس کراکے ریکارڈ کی جلدیں تو پوری کر دیں ، ایک جلد آپ کو بھیج رہا ہوں۔ آپ کو جب بھی ہندوستان سے کسی کتاب کی ضرورت ہو تو بے تکلف لکھ دیا کیجیے۔ آپ کا بڑا بھائی دہلی میں بیٹھا ہوا ہے۔''(۷)

اس کے علاوہ وہ خط جو خلیق انجم نے ڈاکٹر اسد فیض کو اُن کے بائی پاس ہونے کی اطلاع ملنے پر لکھا تھا ، بہت اہم ہے۔اس میں جس طرح خلیق انجم نے ڈاکٹراسد فیض کو تسلی دی ہے وہ اپنی مثا ل آپ ہے۔ ایک ہم درد انسان دوسرے انسان کو اس سے بہتر انداز میں تسلی نہیں دے سکتا ۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوط علم وادب کی گفتگو یا اُن کی بیگم کی بیماری کے ذکر سے متعلق ہیں ۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ وزیر آغا اپنی بیگم کی بیماری اور اُن کے علاج کے لیے کس قدر فکر مند رہتے تھے اور اپنی ادبی سرگرمیوں کو موخر کرنے میں کوئی تردد نہیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر اسد فیض جب شہزاد منظر پر اپنا مقالہ لکھ رہے تھے، یہ خطوط اُن دنوں کے ہیں ۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے خطوط میں اس ضمن میں کچھ نقاط پیش کیے مگر ایک خط وہ بھی ارسال کر دیا جو انہوں نے شہزاد منظر کو اُن کی کتاب ''پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال'' ملنے پر لکھا تھا۔ ڈاکٹر اسد فیض نے یہ خط بھی یہاں پیش کیا ہے ۔ یہ خط دوستانہ انداز میں اختلافِ رائے اور تصحیح کرنے کی ایک نادر مثال ہے۔ ایک بڑی کمال کی بات لکھی ہے ، لکھتے ہیں :

> ''آپ کی یہ کتاب لاہور اور سرگودھا کے ادبی حلقوں میں زیرِ بحث آئی ہے۔ ان سب حلقوں میں ایک ہی خیال مشترک پایا گیا ہے کہ پاکستان میں اُردو تنقید کے عنوان کے تحت محض چند پسندیدہ ناقدین کے خصوصی مطالعے شامل کرنے سے ایک غلط تاثر مرتب ہوا ہے۔۔۔۔ یہ اچھا نہیں ہے کسی تنقیدی کتاب کے بارے میں اس قسم کا تاثر پھیلنا نہیں چاہیے کہ اس کے مصنف نے جانب داری کا مظاہرہ کیا ہے۔''(۸)

'' مکاتیب:ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بنام ڈاکٹر اسد فیض'' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ ڈاکٹر روبینہ شاہین نے قلم بند کیا ہے ۔(۹) اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے وقت کے ایک اہم محقق ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر اسد فیض کو علمی اور تحقیقی حوالوں سے کس قدر اہم جانتے تھے ۔ وہ ڈاکٹر اسد فیض کو بہت مخلصانہ مشوروں سے نوازتے ہیں اور یہ سمجھتے ہوئے کہ ڈاکٹر اسد فیض میں تحقیقی کاموں کی لگن کس قدر ہے ، وہ انہیں تحقیقی کاموں کے لیے متحرک رکھنا چاہتے ہیں ۔ ان خطوط سے ڈاکٹر اسد فیض کی تحقیقی کاوشوں سے بھی کماحقہ آگہی ملتی ہے کیوں کہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اُن کے ہر تحقیقی کام پر اپنا ردِ عمل ان خطوط کے ذریعے ظاہر کرتے رہے ہیں ۔

ڈاکٹر اسد فیض کے نام لکھے گئے ممتاز مفتی کے چند خطوط کو بھی ڈاکٹر اسد فیض نے اپنے ایک تحقیقی

مضمون'' ممتاز مفتی کے خطوط'' میں مرتب کیا ہے۔یہ خطوط اس عہد میں لکھے گئے جب ڈاکٹر اسد فیض نے رسالہ'' فکرِ نو'' کا ممتاز مفتی نمبر شائع کرنے کا ارادہ کیا اور اس سلسلے مین ممتاز مفتی سے رابطہ کیا۔لہٰذا یہ خطوط بنیادی طور پر اسی معاملہ سے متعلق ہیں مگر اس کے باوجود دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں ۔ان خطوط سے ممتاز مفتی کی شدید علالت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

'' آج کل خط لکھنے جوگا نہیں ہوں ۔ دوماہ ہسپتال رہا۔ تین آپریشن ہوئے۔۔۔۔ ہسپتال سے آیا تو برانکائٹس نے حملہ کر دیا۔ منہ کے اندر السر ہو گئے۔ ڈاکٹر نے بولنا بند کر دیا لکھنا پہلے ہی بند تھا۔''(۱۰)

ان خطوط سے ممتاز مفتی کی عاجزی اور انکساری بھی جھلکتی ہے اور اصول پسندی بھی ۔اُن کی فکری کشادگی کا بھی اظہار ہوتا ہے اور ذہنی وسعت کا بھی پتہ چلتا ہے ۔مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں :

'' فیض نمبر نکالا، بہت خوب کیا ، وہ بڑا شاعر تھا۔ اگرچہ خوامخواہ سوشلزم کی دُم لگا رکھی تھی ۔ بہر صورتِ فکر نو کے لیے موزوں تھا۔ ممتاز مفتی پرانا لکھنے والا ہے ، بوسیدہ ہے۔فکرِ نو کے لیے موزوں نہیں''(۱۱)

ڈاکٹر اسد فیض کا ایک محبوب مشغلہ معروف ادیبوں اور شاعروں کے انٹرویو کرنا بھی ہے ۔ بقول طاہر مسعود''انٹرویو کے فن کو ہمارے ہاں بالعموم نظر انداز کیا گیا ہے۔''(۱۲) حالاں کہ انٹرویو ادیبوں کے باطن تک رسائی کا ایک اہم ذریعہ ہے ۔ اسی لیے بقول ڈاکٹر محمد علی صدیقی '' ادبی انٹرویو نگاری مغرب میں ایک مہتم بالشان ادبی صنف کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔'' (۱۳) سقراط بھی جب مکالمہ (**Dialogue**) کرتا تھا تو بنیادی طور پر انسانی باطن اور انسان کی اندرونی سوچ کو باہر لانا ہی اس کا مطمحِ نظر ہوتا تھا۔ افلاطون نے بھی اپنے مکالمات سے یہ ثابت کیا تھا کہ علم باہر سے داخل نہیں ہوتا بلکہ پہلے سے موجود ہوتا ہے ۔

جدید عہد میں لاشعور دریافت ہوا تو اُس کے ساتھ ہی لاشعور کو بار بار دریافت کرنے کا ایک طریقہ

بھی ڈھونڈ نکالا گیا جسے تحلیل نفسی کہتے ہیں ۔ فرائیڈ نے اس طریق سے لاشعور کی دریافت کو ممکن بنایا۔ اس طریق میں بھی ہم کلامی یا مکالمہ بنیاد بنتا ہے جو لاشعور کی خفتہ تہوں کو سامنے لاتا ہے ۔

بہر حال مکالمہ یا انٹرویو میں کچھ سوال اُٹھائے جاتے ہیں جس سے جواب دینے والے کا چہرہ واضح ہونے لگتا ہے مگر یہ امر واقع ہونے کے لیے ضروری ہے کہ سوال کرنے والا اپنے مخاطب کے ساتھ ہم دردی کا رشتہ رکھتا ہو۔ سوال کرنے والے کو جواب دینے والے کی ذہنی سطح تک اُٹھنا پڑتا ہے ، پھر وہ رابطہ قائم ہوتا ہے جس سے باطن تک رسائی ممکن بنتی ہے۔ ڈاکٹر اسد فیض کے انٹرویوز دیکھیں تو ہمیں یہی کیفیت دکھائی دیتی ہے اسی لیے ڈاکٹر اسد فیض لکھتے ہیں :

''انٹرویو نگاری میری نظر میں ایک آرٹ ہے اور اس کو موزوں ترتیب سے تحریر کرنا بھی ایک تخلیقی کام سے کم نہیں ۔ انٹرویو نگاری تحقیق کے حوالے سے بھی بے حد اہم ہے کہ اسے ابتدائی ماخذ کی معتبر حیثیت بھی حاصل ہے۔''(۱۴)

''دید بان'' کتاب میں ڈاکٹر اسد فیض کے بارہ ادبی شخصیات سے کیے گئے انٹرویوز شامل ہیں ۔ ان شخصیات کے نام ملاحظہ کیجیے:

۱۔ممتاز مفتی ۲۔سید قاسم محمود ۳۔امراؤ طارق
۴۔شہزاد منظر ۵۔رفیق چوہدری ۶۔ادیب سہیل
۷۔ارشد ملتانی ۸۔عاصی کرنالی ۹۔علی تنہا
۱۰۔اسلم انصاری ۱۱۔ڈاکٹر نجیب جمال ۱۲۔ڈاکٹر محمد امین

اگر ہم ان ناموں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں شاعر بھی ہیں ، افسانہ نگار بھی ، نقاد بھی ، محقق بھی اور صحافی بھی ہیں ۔ اور مختلف مکتبہ فکر سے متعلق شخصیات کا چناؤ ہے ۔ اس لحاظ سے اُن کا انٹرویو کا دائرہ کافی وسیع ہو جاتا ہے ۔ ڈاکٹر اسد فیض بلا شبہ کسی ایک مکتبہ فکر یا کسی ایک صنف کے تخلیق کار تک

محدود نہیں رہتے ۔ اسی لیے اُن کے انٹرویو میں تنوع نظر آتا ہے اور سوالوں کی یکسانیت بھی جگہ نہیں بنا پاتی۔
ممتاز مفتی جن کے بارے میں ضمیر جعفری کا کہنا تھا کہ ’’ ممتاز مفتی اُردو ادب میں اسلوب دیگر کے الگ دبستان کے خالق ہیں ۔‘‘(۱۵) جب کہ بقول ڈاکٹر رشید امجد ’’ ممتاز مفتی ایک شخص نہیں بلکہ ایک عہد کا نام ہے ۔‘‘(۱۶) ایسی شخصیت کا انٹرویو کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا ۔لیکن ڈاکٹر اسد فیض نے ممتاز مفتی سے بڑے اہم سوالات کیے اور اُن کے ادبی نقطہ منظر کو جاننے اور سامنے لانے کی پوری کوشش کی ۔ مثلاً ایک سوال تو یہی تھا کہ ’’ آپ کا زندگی کے بارے میں کیا فلسفہ ہے؟‘‘ اس کے جواب میں ممتاز مفتی کا فلسفۂ حیات واضح ہو جاتا ہے ۔ وہ کہتے ہیں :

’’میری رائے میں نیکی کے کام نیکی کے حوالے سے نہیں بلکہ اپنے رب کو راضی کرنے کے لیے کرنے چاہئیں ۔۔۔۔ زندگی بہت خوب صورت چیز ہے اور کائنات کی ایک ایک چیز کسی معجزہ سے کم نہیں ۔۔۔۔ زندگی میں غم ، خوشی سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کیوں کہ خوشیاں سطح تک رہتی ہیں لیکن دکھ کی لہریں روح تک سرایت کرتی ہیں اور زندگی کا عظیم تجربہ دکھ سے جنم لیتا ہے ۔‘‘(۱۷)

اسی طرح ڈاکٹر اسد فیض نے ترقی پسندوں سے ممتاز مفتی کے اختلاف اور ترقی پسند تحریک کے بارے میں اُن کی رائے دریافت کی ۔ ممتاز مفتی کے جواب سے معلوم ہوتا کہ وہ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی لوگوں کو بیرونی ایجنٹوں کے آلہ کار سمجھتے تھے۔ مارکس کو مخلص دانش ور ماننے کے باوجود اُسے دنیا میں شر پیدا کرنے والا سب سے بڑا شخص بھی سمجھتے تھے اور یہاں یہ بات بھی سامنے آئی کہ ممتاز مفتی معاشرے میں انسان کے سوشل مسائل سے اپنا کوئی تعلق نہیں سمجھتے تھے۔ کہانی اُن کی نظر میں وہی اچھی ہوسکتی ہے جو قاری پر اثر کرے۔ ڈاکٹر اسد فیض کے ایک اہم سوال کے جواب میں اُن کا کہانی سے متعلق بڑا اہم نظریہ سامنے آتا ہے ۔ وہ کہتے ہیں :

’’ کہانی کو لکھو بیان نہ کرو۔۔۔۔ کہانی میں جذبہ بے حد اہمیت کا حامل

> ہوتا ہے اور خیال کو جذبے میں ڈبو کر لکھو تا کہ پڑھنے والے پر اثر کرے۔ اس کے علاوہ کسی بڑے مرکزی خیال کے بغیر کہانی نہیں بنتی اور ہر کہانی بڑی کہانی نہیں ہوتی ۔"(۱۸)

ممتاز مفتی ؛ قدرت اللہ شہاب کو بڑا بزرگ ہی مانتے ہیں اور صدر ایوب کو پاکستان کی بہترین شخصیت تسلیم کرتے ہیں ۔ پاکستان کے بارے میں اُن کا عقیدہ ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے یہاں بڑے بڑے لوگ موجود ہیں اس لیے پاکستان کے لیےفکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اسے کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے ۔ اُن کا خیال ہے کہ آخری امام کا ظہور بھی پاکستان میں ہو گا جو یہاں بیٹھ کر ساری دنیا کے مسلمانوں کو کنٹرول کریں گے ۔

سید قاسم محمود بڑی ہمہ جہت ادبی اور علمی شخصیت کے حامل فرد تھے۔ انہوں نے ادب اور علم کے ساتھ ساتھ صحافت میں بھی اپنی خدمات پیش کی ہیں ۔ ڈاکٹر اسد فیض نے اپنے انٹرویو میں اُن کی ادبی اور صحافی دونوں زندگیوں کو موضوع بنایا ۔ سید قاسم محمود کی ادبی زندگی کا سفر بہت کٹھن اور دلچسپ تھا۔لیکن اُن کی انتھک محنت نے انہیں کامیاب ادیب بنا دیا۔ پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے سوال کے جواب میں اُن کا کہنا ہے کہ :

> " قائداعظم اور اُن کے رفقائے کار کے بعد آنے والے حکمرانوں نے علمائے دین کو اور علمائے دین نے حکمرانوں کو اپنے اپنے مفادات کے لیے اتنا استعمال کیا کہ آج ہمارے ملک میں اسلام کا مفہوم ملائیت بن کر رہ گیا ہے۔پاکستان کے فکر وعمل کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والی چیز اور ہمیں ہمارے نصب العین سے منحرف کرنے والی چیز ملائیت ہے اور یہ ہی چیز ہمارے مستقبل کو تاریک کیے ہوئے ہے ۔"(۱۹)

سید قاسم محمود کا ایک کارنامہ اُن کا اشاعتی پروگرام تھا۔ اُن کی پبلشنگ کا بنیادی ایجنڈا گھر گھر کتاب

پہنچانا تھا اور یہ ذمہ داری قبول کرنا کہ پبلشر کو تخلیقی یا علمی سطح پر کیا چھاپنا چاہیے۔ اسی لیے سید قاسم محمود نے اپنے اشاعتی ادارہ '' شاہکار بک فاؤنڈیشن '' سے کتابوں کے ایسے سلسلے جاری کیے جو انتہائی سستے داموں قارئین کو میسر تھے۔

رقابت کو زندگی کا حصہ تسلیم کرنے کے باوجود سید قاسم محمود ادبی گروہ بندیوں کو غیر ادبی سرگرمیوں کا نام دیتے ہیں اور اس کی قطعاً حمایت نہیں کرتے ۔

امراؤ طارق جن کے بارے میں ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں کہ '' امراؤ کی کہانیوں میں جہاں ایک بڑے منظر نامے میں بکھرتے عہد ہیں وہاں سماج کی بنیادی اکائی میں بھی گرم جوشی اور توانا رشتے رسموں کی بھینٹ چڑھتے دکھائی دیتے ہیں ۔''(۲۰) ایک اہم افسانہ نگار ہیں ۔ انہوں نے کراچی کے المیہ پر بیشتر کہانیاں لکھیں۔ ڈاکٹر اسد فیض نے اُن سے اُن کے فن اور اُردو افسانہ نگاری سے متعلق اہم سوالات کیے۔ امراؤ طارق کا نقطہ منظر یہ ہے کہ وہ جو افسانہ لکھیں اُس کا کوئی بڑا مقصد ہو اور انہیں جب کوئی واقعہ ، کوئی جملہ یا کوئی خیال ایسا محسوس ہو کہ اُس میں افسانہ بننے کی صلاحیت نظر آئے تو پھر وہ لکھتے ہیں ۔ امراؤ طارق خاکہ نگار بھی ہیں اور اُن کی کتاب '' دھنک کے باقی ماندہ رنگ '' خاکوں کا مجموعہ تھی ، اس لیے ایک سوال کے جواب میں وہ افسانہ اور خاکہ میں فرق بڑی خوبی سے بیان کرتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں :

> '' افسانے میں آپ خود کردار منتخب کرتے ہیں اور اس میں رنگ بھرتے ہیں جب کہ خاکہ میں ایک کردار پہلے ہی سے آپ کے پاس ہوتا ہے ہماری مرضی کے رنگ نہیں ہوتے صرف محبت ہماری ہوتی ہے ۔۔۔۔ میرے خیال میں خاکہ افسانے کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے۔''(۲۱)

امراؤ طارق علامتی تحریک کو ایک نعمت تو قرار دیتے ہیں کہ یہ ایک تجربہ تھا مگر ہر ایک کے علامتی افسانہ لکھنے سے علامتی افسانہ کو نقصان پہنچا اور کوئی بڑا لکھنے والا اس تحریک کو میسر نہیں ہوا۔ مجموعی طور پر وہ اس بات کے قابل نہیں کہ ایک ہی فن پارے سے مختلف قارئین معانی اخذ کریں ، اسے وہ لکھنے والے کی کمزوری سمجھتے ہیں ۔ اُن کا کہنا ہے کہ '' میں چاہتا ہوں کہ میں جو کہنا چاہتا ہوں میرا

قاری وہی سمجھے۔''(۲۲)

نقاد کی کارکردگی سے وہ کچھ زیادہ خوش نہیں اور ناول لکھنے کو ایک مشکل کام سمجھتے ہیں ۔ معاشرے میں مطالعے کی عادت کم ہونے سے نالاں ہیں اور ادیبوں کی گروہ بندی کو وہ محسوس نہیں کرتے ۔ امنِ عامہ پر اٹھائے گئے سوال کا جواب امراؤ طارق کا حروف زر سے لکھنے کے قابل ہے ۔ اس ضمن میں کہتے ہیں :

> یہ جو معاشرے میں انتشار ہے اس کا سبب فنونِ لطیفہ سے لاتعلقی ہے۔ فنونِ لطیفہ دلوں کو گداز بخشتے ہیں ۔ ان سے دوری کے سبب انسان میں بے رحمی پیدا ہوتی ہے جس سے معاشرے کا توازن بگڑ جاتا ہے اور نفرتیں بڑھ جاتی ہیں اس لیے ادب، شعر ، افسانے کو پڑھنا چاہیے۔''(۲۳)

شہزاد منظر اُردو کے اہم نقاد تھے۔ اُن کا بنیادی میدان اُردو افسانہ تھا اور افسانے کی تنقید میں انہوں نے خود کو بلا شبہ ثابت کیا۔ نظیر صدیقی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ''انہوں (شہزاد منظر) نے پاکستانی افسانے کے نشوونما اور اُس کے ارتقا کو غور سے دیکھا ہے اور وہ پاکستانی افسانے کے میلانات اور مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں''(۲۴) اور ایم ۔ خالد فیاض ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''شہزاد منظر اُردو افسانے کے ان ناقدین میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر افسانے کے مطالعے اور تنقید لکھنے میں صرف کر دی ۔'' (۲۵) ڈاکٹر اسد فیض نے شہزاد منظر پر پی ۔ ایچ ۔ ڈی کا مقالہ بھی تحریر کیا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ۔ شہزاد منظر بنیادی طور پر ایک ترقی پسند نقاد تھے اور ترقی پسند نقادوں کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ وہ مارکسی نظریہ سے وابستگی میں بہت اٹوٹ ہوتے ہیں ۔ اس لیے ڈاکٹر اسد فیض کا شہزاد منظر سے یہ سوال کہ کیا ادب تخلیق کرتے وقت ادیب کی خاص نظریے سے وابستگی ضروری ہے؟ بڑا معنی خیز تھا۔ اس کے جواب میں شہزاد منظر نے جواب دیا کہ اُس سے اُن کی ناقدانہ بصیرت کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے ۔ وہ کہتے ہیں :

> ''میں انتہائی کمٹڈ ترقی پسند تھا لیکن جب عالمی سطح پر تبدیلیاں رونما ہوئیں تو میں نے محسوس کیا۔۔۔۔ کہ ادب کو صرف ادب ہونا

چاہیے۔۔۔۔ میرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ نظریہ سے کمٹ منٹ تو سمجھ میں آتی
ہے لیکن پارٹی سے کمٹ منٹ ہونا ضروری نہیں ۔۔۔۔ نظریہ دراصل
زندگی کو سمجھنے کا ذریعہ ہے ۔'' (۲۶)

اکثر مفکرین کا خیال ہے کہ ناقدین کے لیے تخلیقی عمل زیادہ مشکل ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ **Over consicous** ہو جاتا ہے ۔شہزاد منظر نے افسانے بھی لکھے اور ایک ناول بھی مگر اس ضمن میں اُن کا کہنا ہے کہ '' میں نے جب افسانہ اور ناول کے بارے میں کچھ پڑھ لیاتو میں آرٹ **Consicous** ہو گیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب مجھ سے آسانی سے افسانہ نہیں لکھا جاتا ہے ۔''(۲۷) واقعی ایسا ہی ہوتا ہے ۔لیکن وہ افسانہ یا ناول لکھنے کو بے حد عظیم فن سمجھتے ہیں ۔ ادب اور ناول سے متعلق شہزاد منظر کے خیالات بھی انتہائی دلچسپ اور قابلِ غور ہیں ۔ وہ ادب کو محض تنقیدِ حیات اور ناول کو کوئی معمولی تخلیقی کارنامہ نہیں سمجھتے بلکہ اُن کا کہنا ہے کہ :

'' ادب صرف تنقیدِ حیات نہیں ،تعبیر حیات بھی ہے، اس کے علاوہ ہر
بڑے ادب کی خوبی ہے کہ وہ انسانی زندگی کی تفتیس کا فریضہ بھی انجام
دے ۔ زندگی کیا ہے، انسان کیا ہے، کائنات کیا ہے یعنی زندگی کی
معنویت کا پتہ چلائے۔۔۔۔ زندگی کی صحیح تعبیر صرف ناول کی صنف
کے ذریعہ سے ممکن ہے ۔ اس میں پوری کائنات ، پوری تاریخ کو ناول
نگار سمو سکتا ہے ۔''(۲۸)

شہزاد منظر کی تنقیدی آرا بہت بے باک ہوتی ہیں وہ '' راجہ گدھ'' کو ایک احمقانہ ناول کہتے ہیں اور ''علی پورر کا ایلی'' کو سوانحی ناول ، جو اُن کے خیال میں لکھنا بے حد سہل ہے ۔ مجموعی طور پر شہزاد منظر کے اس انٹرویو سے اُن کا ادب سے گہرا لگاؤ بہت واضح ہے۔علی حیدر ملک نے ایک جگہ کہا تھا کہ'' ''شہزاد کو ادب سے سچا اور گہرا لگاؤ ہے ۔'' (۲۹) اس انٹرویو سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے ۔

رفیق چوہدری بھی ایک نام ور ترقی پسند افسانہ نگاراور ناول نگار ہیں ۔ اُن کا پیشہ باغبانی ہے مگر وہ

لکھنے لکھانے سے پوری زندگی وابستہ رہے اور ادب کی خدمت کرتے رہے۔ ڈاکٹر اسد فیض نے اُن کا انٹرویو بھی بڑی محنت سے مرتب کیا ہے ۔ رفیق چوہدری کے پہلے مجموعہ ''محبتوں کے چراغ '' پر ہی فحاشی کے الزام میں مقدمہ ہو گیا۔ اس کے بعد بھی اُن کے مختلف افسانوں پر مقدمے ہوتے رہے۔ اس ضمن میں اُن کی ملاقات سعادت حسن منٹو سے بھی ہوئی ، جن کے اصرار پر رفیق چوہدری نے انہیں پانچ روپے دیے اور اُنہی پانچ روپوں کی شراب پی کر سعادت حسن منٹو اگلے دن وفات پا گئے۔ مہدی علی صدیقی کے نام سعادت حسن منٹو کا وہ رقعہ جو رفیق چوہدری کے ہاتھ دیا گیا ، وہ سعادت حسن منٹو کی آخری تحریر ثابت ہوا۔

رفیق چوہدری کی مقدموں سے متعلق داستان بہت دلچسپ ہے ۔ منٹو کے بعد شاید رفیق چوہدری ہی ایسے افسانہ نگار ہیں جنہیں اس قدر مقدموں کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈاکٹر اسد فیض کے سوالات بھی ایسے تھے کہ جوابات میں یہ ساری داستان رقم ہوتی چلی گئی ۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے اُن کی وابستگی بہت گہری تھی۔ اس ضمن میں اُن کا خیال ہے کہ :

> ''میں سمجھتا ہوں کہ میں پیدائشی کمیونسٹ ہوں ۔۔۔ انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کی صورت میں پاکستانی معاشرے کو ایک بڑی اچھی ٹیم ملی تھی جس نے برائیوں اور گھناؤنے گوشوں کو بے نقاب کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے صحت مند اور روشن پہلوؤں کی بھی نشان دہی کی ۔ برائیوں کے خلاف محاذ قائم کیے اور آنے والی نسل کو صحیح ڈگر پر چلنے کا سلیقہ دیا۔''(۳۰)

ادب میں تنقید کے کردار کے حوالے سے وہ تنقید کے خلاف نہیں مگر تنقید کو جو ذمہ داری کا ثبوت دینا چاہیے اور جو محنت کرنی ہوتی ہے وہ نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے انہیں دکھ ہوتا ہے ۔

ادیب سہیل ایک نام ور محقق، نقاد، شاعر اور مدیر ہیں ۔ ادبی تاریخوں اور تذکروں میں ادیب سہیل کی ادبی خدمات کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر بھی سراہا گیا ہے ۔ وہ ایک طویل عرصہ تک انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی کے ادبی جریدہ '' قومی زبان'' کے مدیر بھی رہے۔ ڈاکٹر اسد فیض کا اُن سے انٹرویو بھی بہت اہم رہا۔ اُن کا بنیادی تعلق کلکتہ سے تھا ۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کر کے مشرقی پاکستان چلے گئے۔ پہلا

واقعہ جس نے اُس کی تخلیقی قوت کو مہمیز لگائی ، بنگال کا قحط تھا، جس میں رقص کرتی موت سے اُن کا براہِ راست تجربہ ہوا۔ مارکس اور سٹالن کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ادیب سہیل کہتے ہیں :

'' مارکس نے چھبیس برس کی عمر میں ایک ایسی تہذیب کا تصور بھی دیا تھا جس میں وقار ہو۔ اُسے اس نے 'ریلیجن آف لاء' کہا تھا بعد میں سٹالن نے اسے 'ریلجن آف کروڑ لاء' کر دیا جو کہ روس کے انتشار کا سبب بنا۔''(۳۱)

نقاد کے حوالے سے ایک بہت ہی اہم بات ادیب سہیل نے کہی۔ وہ کہتے ہیں '' میں دعوے سے کہتا ہوں کہ آج کا نقاد پڑھ کر نہیں لکھ رہا بلکہ لکھے کو لکھے جا رہا ہے۔ حالاں کہ آج کا نقاد تخلیق کار سے زیادہ اہم ہے۔''(۳۲) مجموعی طور پر ادیب سہیل پاکستان کے بعد تخلیق ہونے والے پچاس سالہ ادب اور تنقید سے بہت مطمئن ہیں ۔ اُن کا خیال ہے کہ ہمارے ادب نے ان پچاس سالوں میں بے پناہ ترقی کی ہے اور اسے دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک کے ادب کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔ جامعات میں ہونے والی تحقیق سے بہر حال وہ کچھ زیادہ مطمئن نہیں ۔ ادبی گروہ بندیوں کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اُن کا کہنا ہے کہ اگر گروہ بندی سے ادب کے مثبت مقاصد حاصل ہوں تو یہ موزوں ہے ورنہ انتہائی مضر ہے۔ اسی طرح وہ مشرقی پاکستان کے سانحہ کو اس صدی کا عظیم المیہ بتاتے ہیں جس کے نتیجے میں ان جیسے لوگوں کو دوسری بار ہجرت کے تجربے سے گزرنا پڑا۔

ارشد ملتانی اُردو کے معروف ترین شاعروں میں سے ایک ہیں ۔ اُن کے بارے میں ڈاکٹر اے بی اشرف نے لکھا ہے کہ '' ارشد ملتانی نے غزل کے مخصوص مزاج اور سانچے میں رہتے ہوئے تجربات کے تنوع اور تلون سے اس میں سادگی کا رس سمو دیا ہے ۔''(۳۳) اور ایم ۔خالد فیاض نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''ارشد ملتانی کی شاعری میں انسان جب زندگی کا سامنا کرتا ہے تو وہ اُس کی رنگینوں اور تلخیوں دونوں سے بہ یک وقت آنکھیں چار کرتا ہے اور زندگی کے ہر امکان کو مدِ نظر رکھتا ہے ۔''(۳۴) ارشد ملتانی اُن شاعروں میں سے ہیں جن کے ہاں ہمیں زندگی اور فن کا بہترین امتزاج نظر آتا ہے ۔ زندگی کا تجربہ اور بہترین فن کا مظاہرہ اُن کی شاعری کی پرداخت کرتا ہے ۔ اُن کی شاعرانہ حیثیت کو دیکھتے اور جانتے ہوئے ڈاکٹر اسد فیض

نے اُن کا خوب انٹرویو کیا ہے جس سے ہمیں اُن کے نظریات کو جاننے میں کافی مدد ملی ہے ۔

ارشد ملتانی کے خاندان میں کوئی شاعری نہیں کرتا تھا جس تجربہ نے ارشد ملتانی کو شاعری کی طرف راغب کیا وہ محبت کا تجربہ تھا۔ اُن کی پسندیدہ صنف غزل رہی گو انہوں نے اور بھی اصناف میں شاعری کی ۔ اس سوال کے جواب میں کہ اچھی شاعری کے اجزاء کیا ہیں ؟ ارشد ملتانی کہتے ہیں کہ :

'' اچھا خیال جو معاشرے کو خوب صورت انداز میں آگے بڑھائے یا نئی بات سمجھائے وہ اچھا شعر ہے۔ اس کے علاوہ شاعر کا اظہار اور نظریہ بھی اچھی شاعری کا باعث ہوتا ہے ۔'' (۳۵)

ارشد ملتانی نے اپنے ابتدائی اشعار بھی بتائے جو ۱۹۴۵ء کے لاہور سے شائع ہونے والے پرتاپ کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوئے ۔ اس میں ایک مصرعہ دیا گیا تھا جس پر ارشد ملتانی نے چند اشعار کہے جن میں سے دو یہ تھے:

''افسردہ و ملول کبھی شادماں رہے
گلشن میں ہم بہ رنگ ِ بہار و خزاں رہے

مٹنا نہیں لکھا ہوا تقدیر کا کبھی ! !
دشمن ہزار بار مرا آسماں رہے !''(۳۶)

ارشد ملتانی ادب برائے زندگی کے قائل ہیں ۔ اُن کا خیال ہے کہ شاعری اور ادب سے سوچ کو نئی راہیں دکھائی چاہئیں اور روشن خیال کو آگے بڑھانا چاہیے۔ سیاست پر بھی ارشد ملتانی واضح نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ اس لیے جب ڈاکٹر اسد فیض نے اُن سے سوال کیا کہ عصرِ حاضر میں ملک کی سیاسی صورتِ حال کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ :

''یہ سیاسی بیداری کا دور ہے سیاست معاشرے کو اصلاح کے راستے پر لے جاتی ہے ۔ بڑے بھلے افراد ہر دور میں رہے ہیں ۔ فرق یہ ہے کہ نام لوٹے اور لفافے اب زبان زد عام ہوئے ہیں وگرنہ ایسے لوگ پہلے بھی موجود ہوتے تھے۔ مجموعی طور پر ہم سیاست کے بہترین دور سے گزر رہے ہیں۔(۳۷)

عاصی کرنالی بھی ایک اور ملتان ہی کے نہیں اُردو کے بھی نام ور شاعروں میں سے ایک ہیں ۔ جن کی شعری صلاحیتوں کا لوہا بڑے بڑے شعراء کرام نے مانا ہے ۔ اُن کے آدھ درجن کے قریب شعری مجموعے شائع ہوئے۔ اُن کا مسلک ہے کہ ایسی قلبی واردات جو شاعر پر نہ گزری ہو وہ اگر اُسے قلم بند کرنا ہے تو ایسی شاعری تخلیقی اعتبار سے کم زور ہوتی ہے۔ اس لیے انہوں نے ہمیشہ اپنے تجربہ اور قلبی واردات جو اُن پر گزری، اُسے ہی اپنی تخلیق کا موضوع بنایا ۔

عاصی کرنالی نے خود کو ایک ہی صنف تک محدود نہیں رکھا اور اس کے لیے اُن کا ایک موقف ہے جو بڑی اہمیت کا حامل ہے اور بحث طلب بھی ہے ۔ ڈاکٹر اسد فیض کے سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ :

'' زندگی بے حد وسیع اور متنوع ہے اور اس میں بے حد موضوعات میں ہر موضوع اپنے لیے لباسِ اظہار ساتھ لے کر آتا ہے ۔ اس لیے ہر صنف میں ان کی اپنی جگہ ہے یعنی موضوع خود بتاتا ہے کہ اُسے کس صنف میں لکھا جائے یہ فن کار کے فکری انتشار کا باعث نہیں بلکہ فکر کی توسیع پذیری ہے۔''(۳۸)

اقبال اور فیض کے بعد کوئی بڑا شاعر یا ادیب کیوں پیدا نہیں ہوا؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے عاصی کرنالی نے کہا کہ ان شعرا کا دور مزاحمت کا دور تھا اس وجہ سے اس دور میں بڑا ادب تخلیق ہوا ۔ یعنی اُن کی نظر میں مزاحمت کا عہد ہی بڑے ادب کا باعث ہوتا ہے۔ پاکستان بن جانے سے ادیب کی مزاحمت سست

پڑ گئی کہ ہمیں ملک مل گیا ہے اس وجہ سے زوال آ گیا۔ یہ بحث طلب معاملہ ہے کہ کیا واقعی یہاں کا ادیب مزاحمت کے عہد سے نکل گیا؟ کیا فیض اسی ملک میں بڑا شاعر نہیں بنا؟ان سوالات کا جواب ہمیں عاصی کرنالی کے اس جواب سے نہیں ملتا۔

بہر حال عاصی کرنالی ترقی پسند تحریک سے تو کبھی وابستہ نہیں رہے مگر افلاطون کی آفاقی اقدار حسن، خیر اور صداقت کے پرچار کو اپنی شاعری کا مقصد بنایا ۔ اور وہ ہر لکھنے والے کو ترقی پسند سمجھتے ہیں اور ادب میں گروہ بندی کے قائل نہیں کیوں کہ اُن کے خیال میں اس بات نے ادب کو بے انتہا نقصان پہنچایا ہے اور یہ ادب کا غلط رویہ ہے۔

علی تنہا اُردو کے معروف افسانہ نگار مانے جاتے ہیں جن کی افسانہ نگاری کے بارے میں ڈاکٹر انوار احمد کی یہ رائے صائب ہے کہ ''اس (علی تنہا) کے افسانوں میں واقعات مربوط اور ٹھوس شکل میں پیش نہیں ہوتے بلکہ ویرانی اور تنہائی کا کچھ سناٹا دھواں دھواں تاثر پیدا کرتا ہے ۔''(۳۹) ایسے افسانہ نگار کا انٹرویو کرنا بہت مشکل تھا مگر ڈاکٹر اسد فیض نے بڑی آسانی سے اپنا مطلب حاصل کر لیا۔

علی تنہا،احمد ندیم قاسمی اورمنیر نیازی سے بہت متاثر تھے۔منیر نیازی کی کلاسیکی موسیقی سے پسندیدگی کا ذکر بڑی رغبت سے کیا ہے۔ یوں علی تنہا کی اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی ہوا ہے۔علی تنہا چوں کہ علامتی افسانہ نگار ہیں اس لیے جب اُن سے ڈاکٹر اسد فیضؔ نے پوچھا کہ علامتی افسانہ منفی رجحان ہے اور کیا اس نے افسانے کو نقصان پہنچایا ہے تو علی تنہا نے صاف کہا کہ :

> ''یہ بات درست نہیں ---۔ ہمارے ہاں شرحِ خواندگی کم ہے اس لیے یہ مسئلہ پیدا ہو۔---۔ دراصل اُردو میں افسانہ کا آغاز ہی حقیقت نگاری سے ہوا۔ قوموں کی تربیت نہیں ہوئی ---۔ افسانے میں علامتی رجحان کے ساتھ بھی یہی ہوا اور کچھ لکھنے والوں نے بھی صرف سستی شہرت کے لیے یہ طرز اپنایا۔''(۴۰)

علی تنہا اُردو افسانہ میں رفیق حسین کو بہت اہمیت دیتے ہیں ۔ خاص طور پر اُن کے افسانے '' گوری او گوری'' کی بنیاد پر رفیق حسین کو دنیا کا بہت بڑا افسانہ نگار مانتے ہیں ۔ رفیق حسین کے بعد انتظار حسین اور

سریندر پرکاش کو بھی علی تنہا عالمی سطح کے افسانہ نگارمانتے ہیں ۔لیکن ترقی پسند لکھاریوں سے کافی نالاں ہیں اور اس کی وجہ بھی شاید درست ہے ۔ اس ضمن میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

> ''کرشن چندر ترقی پسند تحریک کا نمایاں نام ہے۔ شروع میں بہت اچھے افسانے لکھے لیکن بعد میں تحریک کے زیرِ اثر تیسرے درجے کے صحافتی افسانے لکھے ہیں ۔ اس سے بہتر تھا کہ وہ نہ لکھتا۔ فیض صاحب کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ اعلیٰ درجے کی ابتداء میں شاعری کی لیکن بعد میں ان کی شاعری میں گراوٹ آ گئی ۔ انہوں نے اپنی کمٹ منٹ کو ایک خاص نقطہ ٔنظر یا نظریہ پر فوکس کر دیا۔ جونہیں ہونا چاہیے تھا۔'' (۴۱)

علی تنہا تنقید کی اہمیت کے بھی قائل ہیں اور افسانے پرلکھی جانے والی اُردو تنقید سے بھی مطمئن ہیں۔ خاص طور پر گوپی چند نارنگ،شمس الرحمٰن فاروقی ، وزیر آغا ،محمد علی صدیقی کی تنقید سے بہت خوش ہیں ۔

اسلم انصاری ملتان کے ایسے شاعر اور ادیب ہیں کہ جن کی شاعری اورفکری کام سے پوری اُردو دنیا واقف ہے ۔ اُن کی شاعری ،تنقید ،تحقیق ہر ایک میں تخلیقی اورتنقیدی شعور کی وہ پختگی نظر آتی ہے کہ جو بہت کم لکھنے والوں کو نصیب ہوتی ہے۔ لسانیات اور تاریخ میں بھی اُن کا کام لائقِ توجہ ہے۔ وہ معلّم بھی اعلیٰ درجے کے رہے ہیں ۔غرض یہ کہ ایسی ہمہ جہت شخصیت کم کم دکھائی دیتی ہے۔ اُن کے بارے میں مختار ظفر ایک جگہ بالکل بجا لکھتے ہیں کہ :

> '' دراصل اُن (اسلم انصاری) کا جمالیاتی احساس اورتخلیقی و تنقیدی وژن ایسے بوقلموں پس منظر کا حامل ہے جوفنونِ لطیفہ کے مختلف رنگوں مثلاً مصوری ، موسیقی ، شاعری ، اساطیر،فنِ تعمیر ، ڈرامااور افسانوی ادب میں انہاک و ادراک سے متشکل ہوا ہے ۔''(۴۲)

ڈاکٹر اسلم انصاری سے لیا گیا ڈاکٹر اسد فیض کا انٹرویو بہت سی باتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اُن کی زندگی سے لے کر اُن کے ادبی اور فکری نظریات تک ، ہر حوالے سے ایک مکمل انٹرویو ہے ۔ ایسی شخصیات کا انٹرویو اصل میں پوری ادبی روایت کو دوبارہ سے زندہ کر دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کی گفتگو میں فکری گہرائی اور دانش ورانہ انداز غالب ہے۔ جس سے معاملاتِ گفتگو ایک گہری معنویت حاصل کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر اسد فیض کے ایک سوال کہ ’’ آپ کا نظریۂ شعر کیا ہے ؟‘‘ کے جواب میں اسلم انصاری کہتے ہیں کہ :

’’ ادب زندگی کی گہرائیوں سے پھوٹتا ہے اور اس کا زندگی سے گہرا تعلق ہے ۔ ادب کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں حسن ضرور تخلیق کیا گیا ہو ۔ ادیب؛ ادب اور شعری زبان کے ذریعے اس میں حسن شامل کرتا ہے ۔ میرا نظریۂ شعر ہے کہ جن تجربات اور حقائق کو پیش کیا جا رہا ہے وہ مجموعی طور پر زندگی کے معانی کو پیش کریں ۔‘‘(۴۳)

علامہ اقبال کے بارے میں اُن کا خیال ہے کہ اُن کی شاعری کی بے انتہا فکری جہتیں ہیں ۔ اُن کے پیغام میں ہمہ گیری بھی ہے اور اُن کی شاعری آج بھی معنی خیز ہے۔ نئے شاعروں کے بارے میں وہ اس بات سے تو خوش ہیں کہ ان میں تجربے کا حوصلہ ہے اور وہ ان تجربوں کو نئے سے نئے انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں مگر اس بات سے خوش نہیں کہ نئی نسل جو روایت کے زندہ عناصر سے اجنبی اور بیگانہ ہوتی جا رہی ہے ۔

تنقیدی ماحول پر بھی بڑی اہم باتیں کیں ۔تنقید کو سب سے زیادہ نقصان گروہ بندیوں نے پہنچایا۔ اسلم انصاری اس بات سے نالاں ہیں کہ نقاد اب تنقید کے دوسرے معیار قائم کرنے لگے ہیں یعنی اپنے گروہ کے کسی فرد کے لیے تنقید کا معیار اور اصول کچھ اور ہو گا اور کسی دوسرے گروپ کے لکھنے والے کے لیے ان کا معیار بدل جائے گا۔ اس لیے وہ معتبر اور سنجیدہ لکھنے والوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اس پر غور کریں اور متوازن ،معروضی اور منصفانہ تنقید لکھنے کا کوئی راستہ نکالیں ۔تنقید کے بارے میں وہ اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں ، کہتے ہیں :

''تنقید ادب کے ارتقا میں اہم کردار ادا کرتی ہے ۔ ادب کی تحسین علمی سطح پر نقاد ہی کر سکتا ہے۔ اس لیے میں تو تنقید کو ادب کا ناگزیر پہلو تصور کرتا ہوں ۔۔۔۔ میری رائے میں اچھا نقاد وہی ہوتا ہے جو ذاتی پسند سے بلند ہو کر ادب کی قدر و قیمت کو دریافت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔'' (۴۴)

ڈاکٹر اسلم انصاری کا یہ انٹرویو اس بات کا ثبوت ہے کہ '' اربابِ فضل و کمال سے براہِ راست استغاضہ کو ہمیشہ مستحسن تصور کیا جاتا رہا اور اس اصول و کلیہ نے بہت سے علوم کو جنم دیا۔''(۴۵)ڈاکٹر اسلم انصاری سے گفتگو ہوتی جاتی ہے اور علم کے دریا بہتے جاتے ہیں ۔

ڈاکٹر نجیب جمال ایک محقق اور نقاد ہیں ۔ انھیں یگانہ چنگیزی کی تحقیق پر اعتبار حاصل ہے۔ اُن کا پسندیدہ تنقیدی و تحقیقی موضوع اُردو شاعری ہے، انہوں نے عصرِ حاضر کی ادبی تحریکوں اور مسائل کے تناظر میں کلاسیکی شعرا کا جائزہ ایک نئے رخ سے لیا ہے۔ وہ پرانی تنقید کے مقابلے میں نئی تنقید لکھنے والوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں ۔ وجہ اس کی یہ بتاتے ہیں کہ :

'' ہمارے ہاں آج کل جو تنقید لکھی جا رہی ہے میں اُس کے معیار سے مطمئن ہوں نئے لکھنے والوں کی تنقید میں جو پھیلاؤ ہے ، اُس نے پورے آفاق کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے ۔''(۴۶)

موجودہ شاعری میں ڈاکٹر نجیب جمال جہاں احمد ندیم قاسمی اور اسلم انصاری سے متاثر ہیں وہاں وہ احمد فراز اور افتخار عارف کا نام بھی لیتے ہیں ۔ مجید امجد کے بارے میں متفکر ہیں کہ اُن پر تنقید نہ لکھے جانے کی وجہ سے اُن کا نظر انداز ہو جانا یقینی دکھائی دیتا ہے۔تنقیدی دبستانوں کے حوالے سے بھی اُن کا خیال بڑا مثبت ہے وہ اس بات کے قائل نظر نہیں آتے کہ کسی فن پارے کو کسی مخصوص دبستان کے تحت دیکھا جائے بلکہ اُن کا کہنا ہے کہ :

''عصرِ موجود میں یہ فن پارے پر منحصر ہے کہ فن کیا تقاضا کرتا ہے۔
اس مناسبت سے نفسیاتی یا عمرانی تنقید کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔
کیوں کہ آپ اس طرح معنی دریافت کرتے ہیں اور تخلیق کی بازیافت کا
عمل انجام پاتا ہے۔''(۴۷)

اُردو کے مستقبل سے بھی ڈاکٹر نجیب جمال کافی مطمئن ہیں ۔ اُن کے خیال مے اُردو زبان کا دامن پھیلتا جا رہا ہے ۔ دنیا کی بہت سی زبانوں کو وہ اپنے اندر جذب کر رہی ہے۔ یہ الگ بات کہ کچھ وجوہ کی بنیاد پر اُردو کو علم کی زبان نہیں بننے دیا گیا مگر بطور ادب کی زبان کے اُردو دنیا کے بڑے ادب کے مقابل رکھی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر محمد امین ،جن کی اصل وجہِ شہرت اُن کی ہائیکو نگاری ہے۔ انہیں اُردو کے اولین ہائیکو نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد امین کے بارے میں کونسلر ، سفارت خانۂ جاپان ، اسلام آباد جناب توشی کازو ایسو مورا لکھتے ہیں کہ :

'' ملتان آرٹس کونسل میں ۔۔۔۔ میری ملاقات ایک ایسے دانش ور سے
ہوئی جو ہائیکو کی جاپانی صنف شاعری پر دسترس رکھتے تھے اور ہائیکو کی
ایک کتاب بھی شائع کر چکے تھے۔ جی ہاں یہ ڈاکٹر محمد امین
تھے۔''(۴۸)

ڈاکٹر محمد امین ۱۹۷۱ء کے لگ بھگ جاپان گئے تھے۔ وہاں وہ اس جاپانی صنف ہائیکو سے متاثر ہوئے۔ اور پھر ۱۹۷۳ء میں اُن کے ہائیکو شائع ہونا شروع ہوئے اور بقول ڈاکٹر محمد امین کہ '' میری اپنی تحقیق ہے کہ اس سے پہلے تجرباتی طور پر ہائیکو لکھی گئی ہے لیکن باقاعدہ آغاز میں نے کیا، کس نے پہلے ہائیکو لکھے اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ ۱۹۸۱ء میں ہائیکو کے نام سے سب سے پہلے میرا مجموعہ چھپا۔''(۴۹)

ڈاکٹر اسد فیض نے ڈاکٹر محمد امین سے ہائیکو سے متعلق بڑے اہم سوالات کیے جن سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں کس طرح ہائیکو اور ڈاکٹر محمد امین کو اس کا ردِعمل سہنا پڑا مگر آہستہ آہستہ ہائیکو کو مختلف شعرا نے اپنا لیا۔ کچھ شعرا نے نئی بحر میں ہائیکو کہنا شروع کیے تو یوں ہائیکو کے اُردو میں دو دبستان بن گئے۔

ڈاکٹر محمد امین نے ''اسلامی تصوف میں فرد کا تصور'' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی اور فلسفہ کے طالبِ علم اور استاد رہے۔ ڈاکٹر اسد فیض کے اسی سوال کے جواب میں کہ'' آج کے دور میں فلسفہ کی کیا اہمیت و افادیت ہے؟'' ڈاکٹر محمد امین کہتے ہیں کہ :

> ''یہاں ہر چیز کی افادیت کو پیسے کے حوالے سے جانچا جاتا ہے اور چوں کہ فلسفہ اس معاشرتی ضرورت کے لیے اہم نہیں اس لیے یہ شعبہ بے توجہی کا شکار ہے۔۔۔ دراصل ہمارے ہاں کسی بھی مسئلہ پر چاہے وہ قومی یا سماجی مسئلہ ہو ، مکالمہ نہیں ہوتا۔ فلسفہ دوسروں کے نقطہ نظر کو تسلیم کرنے کی عادت ڈالتا ہے یعنی کشادہ دلی کا رویہ سامنے لاتا ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں انتشار ان علوم سے بے توجہی کا ہی ایک سبب ہے۔''(۵۰)

یوسف ناظم نے ایک جگہ کہا تھا کہ'' کسی بھی انٹرویو کو زبان و بیان کے لحاظ سے بہت زیادہ گاڑھا نہیں بنانا چاہیے۔''(۵۱) ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر اسد فیض کے یہ انٹرویوز اور مکالمے اس خوبی سے سجے ہوئے ہیں ۔گلزار جاوید کے بقول'' مکالمہ بھی آنے والے وقت میں اپنی حیثیت اور اہمیت ضرور تسلیم کرائے گا۔''(۵۲) یہ بات ڈاکٹر اسد فیض کے ان مکالموں کے بعد بڑی حد تک درست کہی جا سکتی ہے اور اس اہمیت کو منوانے میں ڈاکٹر اسد فیض کا بہت بڑا ہاتھ ہو گا۔ ان انٹرویوز کی بابت جاوید اصغر ایک تبصرہ میں لکھتے ہیں کہ :

> ''مختلف اصنافِ ادب میں کمال رکھنے والے ادیبوں سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں (ڈاکٹر اسد فیض) نے بہت دلچسپ سوالات اٹھائے ہیں

جو اسد کی وسعتِ مطالعہ کے عکاس ہیں ۔''(۵۳)

ڈاکٹر اسد فیض ملتان سے نکلنے والے ادبی جریدہ '' ہم عصر'' کے مدیر بھی رہے۔ اُس کے ایک شمارہ میں انہوں نے ڈاکٹر محمد امین کے خصوصی گوشہ کا اہتمام کیا۔ یہ انٹرویو اُس گوشے کی بھی زینت بنا۔ اس گوشے میں اس انٹرویو کے علاوہ ڈاکٹر محمد امین کی شاعری پر ایک بہت اہم مضمون '' ایک کہانی ہے اہلِ دل کے لیے'' بھی شامل ہے ، جسے غلام حسین ساجد نے تحریر کیا ہے اور اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد امین کی دو نظمیں اور ایک غزل بھی اس گوشہ میں شامل ہوتی ہے۔ غلام حسین ساجد نے بتایا کہ ڈاکٹر محمد امین کی ہائیکو گاری سے نکل کر اُن کی شاعری کو سمجھنے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے جس کی وجہ سے اُن کے شعری کمالات پوری طرح واضح نہیں ہو سکے۔ غلام حسین ساجد نے یہی فریضہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے اور ڈاکٹر محمد امین کے کل شعری سرمایے کو معیارِ نقد و نظر پر ماپنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں ۔ اس مضمون کا انتخاب اور پیش کش یقیناً ڈاکٹر اسد فیض کا کارنامہ ہے کہ یہ مضمون ڈاکٹر محمد امین کی شاعری کو سمجھنے میں ہمیشہ حوالے کا کام دے گا۔ غلام حسین ساجد، ڈاکٹر محمد امین کی شاعری سے متعلق اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے ایک جگہ ان الفاظ میں ڈاکٹر امین کی شاعری کا معیار متعین کرتے ہیں ۔ لکھتے ہیں :

> '' محمد امین کے شعری مزاج کو اختصار راس آتا ہے۔ اس کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے کھل کر بات کرنا اُسے پسند نہیں۔ ایک نا معلوم حجاب ہے جو اُسے کہہ دینے اور خاموش رہنے کے مابین الجھائے رکھتا ہے ۔ اس کی شاعری پر اداسی کی چھاپ بہت گہری ہے۔''(۵۴)

غلام حسین ساجد کی یہ رائے ڈاکٹر محمد امین کی شاعری پر پوری اترتی ہے۔ ہائیکو کی تو خیر صنف ہی اختصار پر مبنی ہے مگر اُن کی نظم اور غزل میں بھی اختصار بنیادی پہلو ہے اور اداسی کی فضا تو ہر جگہ موجود ہے ۔ ایک نظم '' تم کب آؤ گے'' میں سے چند مصرے دیکھیے:

'' دل کہتا ہے
میں زندہ ہوں
اور پہاڑوں پر برف پگھلنے لگتی ہے
مرے گھر کے صحن میں پھول چمکنے لگتے ہیں
دل کہتا ہے
پھر چاروں موسم بیت گئے
تم کب آؤ گے !''(۵۵)

اور اب ایک غزل کے دو اشعار:

''اپنی عادت تھی کہ ہر شے کو مثالی دیکھنا
پھر سفر کے بعد اپنے ہاتھ خالی دیکھنا

وقت کے صحرا میں گم خوابوں کو دن بھر ڈھونڈتے
کاسۂ خواہش بکف آنکھیں سوالی دیکھنا''(۵۶)

''ہم عصر'' کے اس شمارہ کے دیگر مندرجات بھی ڈاکٹر اسد فیض کی شخصیت اور سوچ کی عکاسی کرتے ہیں ۔ اقبال پر دو مضامین ، اسلم انصاری کی نظم پر مضمون ، اُردو افسانے کی ترویج میں ادبی رسائل کے کردار پر مضمون ، کتابوں پر تبصرے اور خود ڈاکٹر محمد امین کا '' کتابوں کی اشاعت کے مسائل'' کے عنوان سے دلچسپ مضمون ، اس شمارہ کی خاص تحریریں ہیں ۔ ڈاکٹر اسد فیض نے اپنے اس مضمون میں پبلشرز کی مصنفین کے ساتھ دھوکا دہی کو خوبی سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے یہ بالکل بجا لکھا ہے کہ :

'' پاکستان میں کتابوں کی اشاعت کے لیے غیر سرکاری اداروں کی جانب سے مصنفین کی مالی امداد کا رجحان بے حد کم ہے جب کہ سرکاری

سطح پر قائم کتابوں کی اشاعت و ترویج کے اداروں میں دوست نوازی کا
چلن عام ہے۔''(۵۷)

ملتان کے ادب اور علمی سرگرمیوں سے اسد فیض کو ابتدا سے ہی دلی لگن رہی ہے۔ اُن کا ایم ۔فل کا تھیسز'' ملتان میں اقبال شناسی'' تھا اور وہیں سے وہ ملتان میں ہوئے والے ادبی کام سے وابستہ رہے ہیں ۔ اسی لگن کی بنیاد پر انہوں نے'' ہم عصر'' کا ایک شمارہ'' ملتان کا عصری ادب نمبر'' نکالا۔ جس میں ملتان کے ناقدین اور افسانہ نگاروں کی ملتان سے متعلق تحریروں کو شامل کیا۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ادبی حوالے سے ملتان کی تاریخ کتنی قدیم اور ضخیم ہے۔ ڈاکٹر اسد فیض نے اس کے اداریہ'' ملتان کا ادبی منظر نامہ'' میں لکھا ہے کہ :

''خطہ ٔ ملتان ابتدا سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں بزرگانِ دین نے نہ صرف اسلام کے فروغ میں حصہ لیا بلکہ علم و ادب کی ترویج و اشاعت میں بھی پیش پیش رہے۔ ابتدا مین یہاں فارسی زبان سکہ رائج الوقت تھی ۔ بعد ازاں اُردو کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ بابا فرید گنج شکر اس ہی خطہ ٔ پاک میں پیدا ہوئے ۔ اُردو زبان کے حوالے سے پہلا جملہ عموماً اُن ہی کی کتب میں دستیاب ملتا ہے ۔ اس لحاظ سے اس خطہ کو اُردو کا مولد اول بھی قرار دیا جا سکتا ہے ۔''(۵۸)

اس شمارہ میں ڈاکٹر مختار ظفر کا مضمون'' ملتان کی شعری روایت''، حمید الفت ملغانی کا مضمون ''ملتان میں سرائیکی ادب'' اور ڈاکٹر اسد فیض کا مضمون'' ملتان میں اُردو کے ادبی جرائد'' خاص طور پر ملتان کے ادبی منظر نامہ کو سمجھنے میں بے حد معاون ہیں ۔ ڈاکٹر مختار ظفر کا مضمون'' ملتان کی شعری روایت'' ایک جامع تحقیقی مضمون ہے جس میں مختار ظفر نے ملتان کی تہذیب کو دنیا کی قدیم ترین تہذیب ثابت کیا ہے اور پھر ابتدا سے لے کر موجودہ عہد تک ملتان کے شعری سفر اور روایت کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے ۔ اور آخر میں ان الفاظ میں اپنا نچوڑ پیش کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

'' یہاں (ملتان) کی شاعری کا مزاج کلاسیکی روایت کا حامل رہا۔بعد میں داخلی محرکات اور خارجی اثرات کے تحت یہاں کے مزاج میں تبدیلی جدید شعری روایت کے آغاز کا باعث بنی ۔ اس طرح ملتان کی شعری روایت کا سفر کلاسیکی انداز سے جدیدیت کی طرف ہے ۔''(۵۹)

''ملتان میں سرائیکی ادب'' کے عنوان سے حمید الفت ملغانی نے سرائیکی زبان میں ہونے والے مختلف اصناف میں ادبی کام کا تفصیلی جائزہ لیا ہے ۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ سرائیکی زبان نے ملتان میں کیسے اپنی نشونما کی اور ملتان نے سرائیکی زبان کی ہر صنف کو فروغ دینے میں اپنا مثبت کردار ادا کیا۔ حمید الفت کا یہ دعویٰ رد کرنا مشکل ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''جہاں تک سرائیکی ادب کی ابتدائی اشاعت کا تعلق ہے تو سرائیکی وسیب کی زیادہ ترتیب ملتان ہی سے اشاعت کے مراحل طے کرنے کے بعد سامنے آتی رہی ہیں ۔ ان کتب میں سی حرفی ، مثنوی ، نعت اور مرثیہ کی اصناف خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔''(۶۰)

ڈاکٹر اسد فیض نے '' ملتان میں اُردو کے ادبی جرائد'' کے عنوان سے ملتان سے شائع ہونے والے ادبی جرائد کا ایک جائزہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے ''ریاض نور''(ملتان سے شائع ہونے والا پہلا اخبار) سے لے کر ''اشارات'' تک تقریباً تمام اخبارات اور ادبی جرائد کا تعارف انتہائی جامعیت سے کرادیا ہے ۔ ان رسائل کے اہم نمبر، خصوصی گوشے ، مدیر ، مدیروں کے مقاصد وغیرہ ، سب سے بنیادی جانکاری حاصل ہو جاتی ہے ۔ انہوں نے ''ساقی'' کو ملتان کا پہلا ادبی جرید ہ جانا ہے جو ۱۹۲۷ء میں ناطق جالندھری نے شائع کیا تھا۔ ان ادبی جرائد کے بارے میں اپنی مجموعی رائے ڈاکٹر اسد فیض نے ان الفاظ میں رقم کی ہے، لکھتے ہیں :

''۱۹۲۷ء سے عصرِ حاضر تک یہ ادبی رسائل ملتان میں شعر و ادب اور علم و فن کی تخلیقی رفتار کے پیمانے اور ملتان کی تہذیبی انفرادیت اور فکری ارتقاء کے عکاس اور ترجمان بھی ہیں ۔۔۔۔ ان میں تقریباً پون صدی پر مشتمل ملتان کی علمی ادبی روایت اور اس کے ہمہ قسم نقوش موجود ہیں جو ایک قیمتی اثاثہ ہیں ۔'' (۶۱)

ملتان کے موجودہ تخلیقی ادب سے متعارف کروانے کے لیے ڈاکٹر اسد فیض نے ملتان کے افسانہ نگاروں کے چھ افسانے اور متعدد شعری تخلیقات پیش کی ہیں ۔ افسانے تو معیاری ہیں ہی مگر شعری تخلیقات کا انتخاب بھی نہایت عمدہ ہے۔ مثلاً خرم خرام صدیقی کی غزل کے یہ اشعار دیکھیے:

''یوں ٹوٹ کے ملتی ہے یہ تنہائی سرِ شام
جیسے کسی دریا پہ ہو صحرائی سرِ شام

آنکھوں کو جلا دیتی ہے باطن کی بصیرت
کچھ اور نکھر جاتی ہے بینائی سرِ شام

پھر بامِ فلک پر اُمڈ آئے گا سویرا
تم پھر سے نہ لینا کبھی انگڑائی سرِ شام ''(۶۲)

یا پھر منیر تنہا کے یہ اشعار دیکھیے:

''ڈھونڈتے اس کو در بہ در تنہا
طے ہوا زیست کا سفر تنہا

مجھ کو راہوں میں چھوڑنے والے
تو بھی بھٹکے گا عمر بھر تنہا

میں ہی تنہا نہیں زمانے میں
ہے خدا بھی تو عرش پر تنہا"(۶۳)

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ڈاکٹر اسد فیض کو مشاہیر ادب سے مکالمہ کرنا بہت پسند ہے، انھوں نے "ہم عصر" کی اسی خصوصی اشاعت میں بھی اس کا خاطر خواہ اہتمام کیا۔ ملتان کی دو اہم ادبی شخصیات سے ڈاکٹر اسد فیض نے مکالمہ کر کے اُسے اس اشاعت کی زینت بنایا ہے۔ ان مین ایک مظہر کلیم اور دوسرے لطیف الزماں خان ہیں ۔ مظہر کلیم ، جاسوسی ناول نگاری کا ایک اہم نام ہیں، جو خطۂ ملتان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ عام طور پر جاسوسی ناول نگاری کو سنجیدہ ناول نگاری کے برابر مقام نہیں دیا جاتا، اس سیاق میں ڈاکٹر اسد فیض کا مظہر کلیم سے یہ انٹرویو ایک خاصے کی چیز ہے ۔ ڈاکٹر اسد فیض نے اسی حوالے سے مظہر کلیم سے ایک خصوصی سوال کیا کہ "کیا جاسوسی ناول نگاری ایک کمرشل ضرورت ہے یا آپ اسے خالص ادب قرار دیتے ہیں ؟" تو مظہر کلیم نے جواب میں کہا کہ :

"جاسوسی ناول نگاری خالص ادب میں شامل ہے لیکن چوں کہ یہ ناول نگاری کے اس زمرے میں آتی ہے جو کم پڑھے لکھے قارئین کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم یافتہ قارئین میں یکساں مقبول ہے اس لیے ان ناولوں کی اشاعت خالص ادب کی اشاعت سے زیادہ باقاعدہ اور وسیع ہے ۔ اس لیے یہ کمرشل ضرورت کے زمرے میں بھی شامل ہے مگر جاسوسی ناول اپنے کردار نگاری ، ماحول کی عکاسی کی بنیاد پر خالص ادب میں شامل ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خالص ادب کے نمائندے اسے لائیٹ لٹریچر کا نام دے کر خالص ادب میں شامل نہیں کرتے مگر اس ادب کی اہمیت اور حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔"(۶۶)

لطیف الزماں خان ، ملتان کے معروف محقق، نقاد ، انشاپرداز ، مترجم اور غالب شناسی میں اہم مقام رکھنے والی شخصیت ہیں ۔ بقول سید عامر سہیل '' لطیف زماں خاں ایک فرد کا نہیں ایک رویے اور طرزِ زیست کا نام ہے۔''(۶۵) اس میں شک نہیں کہ لطیف زماں خان ایک علمی ادارہ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ڈاکٹر اسد فیض نے لطیف الزماں خاں پر ایک الگ سے مضمون بھی لکھا جس میں انہوں نے کہا کہ '' اُن (لطیف الزماں خان) کی علمی سرگرمیاں تاریخِ ادب ملتان کا ایک یادگار باب ہے ۔'' (۶۶) اس حوالے سے لطیف الزماں خان کا انٹرویو بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر اسد فیض نے اپنی مشاقی سے نہایت اہم باتیں لطیف الزماں خان کی زبان سے نکلوائی ہیں ۔ اگرچہ ایسی شخصیت کے مطابق یہ انٹرویو کافی مختصر ہے مگر پھر بھی کافی ہے۔ ''کتاب دوست معاشرہ'' کیوں تشکیل نہیں پا سکا ، اس سوال کے جواب میں کہتے ہیں :

> ''دو کام کسی حکومت نے نہ کیے اول یہ کہ ملک کے اور ملک میں رہنے والوں کے معاشی مسائل کبھی حل نہ ہوئے اور کسی کو سماجی انصاف نہیں ملا۔تعلیم کی کمی بھوک ، افلاس ، بیماری اور بے کاری سے نجات ملتی تو لوگ کتاب کی طرف توجہ دیتے ۔تعلیم عام ہوتی اور ہر ایک کے لیے ہوتی تو کتاب دوست معاشرہ تشکیل پاتا۔''(۶۷)

لطیف الزماں خان بنیادی طور پر اپنے معاشرے اور معاشرتی رویوں سے بہت نالاں ہیں ۔ادب کے قحط الرجال پر وہ آنسو بہاتے ہیں ۔ معاشرے میں ادب ، ادیب اور استاد کی ناقدری کا رونا وہ روتے ہیں جس میں وہ بالکل حق بجانب ہیں کہ اس معاشرہ کی بے حسی واقعی اپنی انتہاؤں کو چھونے لگی ہے۔غرض یہ کہ لطیف الزماں خاں کا یہ انٹرویو بہت سے سوالات ہمارے ذہنوں میں بھی پیدا کرتا ہے ۔

ڈاکٹراسد فیض نے '' ہم عصر'' کا ایک اہم شمارہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کے فکر وفن سے متعلق بھی شائع کیا ۔ اس میں بھی ڈاکٹر اسد فیض نے اُن کے انٹرویو کا اہتمام کیا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی بھی کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں ۔ اقبال ، فیض، فرید، تنقید ، تحقیق، غرض یہ کہ ہر جہت میں کام کیا ہے ۔ بلا شبہ بقول عرش صدیقی '' تحقیق و تنقید سے اُن (طاہر تونسوی) کے مزاج کو خصوصی مناسبت ہے ۔'' (۶۸) اُن کی تنقید میں

گہرائی اور لگن اس حد تک ہوتی ہے کہ ریاض احمد نے اُن کے ایک مضمون کے حوالے سے کہا کہ'' طاہر تونسوی کے مضمون میں بین السطور جو دل سوزی جھلکتی ہے وہ دلوں میں جذباتی چھوت پیدا کر دیتی ہے (اور) سوچ کو مہمیز کرتی ہے۔'' (۶۹) ایسی خصوصیت کے مالک طاہر تونسوی کا انٹرویو بھی ایسی ہی دل سوزی مانگتا تھا جسے ڈاکٹر اسد فیض نے بخوبی پورا کیا۔ ایک تو طاہر تونسوی نے اپنے حالات و واقعات اور تعلیمی مدارج کا نہایت تفصیل سے جواب دیا اور ادبی کارگزاریوں سے آگاہ کیا۔دوسرا ہر سوال کا بڑا دوٹوک جواب مہیا کیا۔ مثلاً ساختیاتی تنقید کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

''ہمار ا سارا ادب مغرب زدگی کا شکار ہے اور ہر تحریک جو وہاں ختم ہونے کے قریب ہوتی ہے وہ یہاں اکیسویں صدی کے دور میں بھی پاکستان میں پیدل چل کر آتی ہے ۔۔۔۔ اصل بات یہ ہے کہ میں نہ تو اس کی مکمل تعریف اور نہ ہی ادب پر اس کے اطلاق کو سمجھ سکا ہوں مجھے ساختیاتی تنقید کے وجود سے انکار نہیں لیکن مجھے اس کی عملی تنقید دکھایئے۔''(۷۰)

اس خصوصی نمبر میں ڈاکٹر اسد فیض نے ڈاکٹر طاہر تونسوی کی مختلف النوع ادبی جہات کا احاطہ کرنے کے لیے ہر حوالے سے مضامین کا انتخاب کیا تاکہ طاہر تونسوی کا ہر ادبی گوشہ منور ہو سکے ۔ لہٰذا اس انتخاب سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی شاعر بھی ہیں، نقاد بھی ، محقق بھی ، مرتب بھی ، فرید شناس، اقبال شناس، فیض شناس اور غالب شناس بھی اور مقدمہ نگار اور تبصرہ نگار بھی ۔ اس طرح یہ شمارہ طاہر تونسوی کی مکمل ادبی زندگی کا انسائیکلو پیڈیا کہا جا سکتا ہے ۔

ڈاکٹر اسد فیض نے لاہور سے نکلنے والے ادبی جریدہ'' سپوتنک'' کے چند شمارے بھی بڑی خوبی سے مرتب کیے۔ ان میں ممتاز مفتی ، رشید امجد اور رفیق چوہدری پر مرتب کردہ اُن کے خصوصی نمبر خاص طور پر اہم ترین کاوشیں کہی جا سکتی ہیں ۔

ممتاز مفتی پر مرتب کردہ اس کتاب میں ڈاکٹر اسد فیض کا وہ ہی ادبی مکالمہ موجود ہے جن کا ذکر ہم گزشتہ اوراق میں کر آئے ہیں جو'' دید بان'' میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر اسد فیض نے ممتاز مفتی پر'' اُردو ادب

کا مہاتما بدھ'' کے عنوان سے مضمون بھی لکھا جو اس کتاب کا حصہ ہے ۔ اس مضمون میں ایک جگہ ڈاکٹر اسد فیض لکھتے ہیں :

'' وہ (ممتاز مفتی) اپنے عہد کے افسانہ نگاروں سے بہت آگے ہیں اور بیسویں صدی کا اہم ادیب ہے لیکن ہمارے ہاں کے پیشہ ور نقادوں نے اس کو دنیائے ادب میں وہ مقام نہیں دیا جس کا وہ مستحق ہے ۔ میں اُسے بیسویں صدی کے عظیم ادیبوں چیکوسلواکیہ کے فرانز کافکا، آئر لینڈ کے جیمز جوائس اور فرانس کے جین پال سارتر کے ہم پلہ ادیب قرار دیتا ہوں ۔'' (۷۱)

بعد میں ڈاکٹر اسد فیض کا یہ مضمون عکسی مفتی کی ممتاز مفتی پر مرتب کردہ کتاب '' مہالو کھا مفتی'' کی زینت بھی بنا۔(۷۲) جس سے اس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

دیگر مضامین میں آغا بابر کا '' ممتاز مفتی'' ، اکرام بریلوی کا ''ہفت رنگ ادیب ، ممتاز مفتی ، رضا علی عابدی کا '' ممتاز مفتی : شخصیت کے چند پہلو''، شہزاد منظر کا '' ممتازمفتی'' جیلانی کامران کا '' ممتاز مفتی کے افسانے''، منشا یاد کا '' ممتاز مفتی بہ حیثیت افسانہ نگار''، نصرت منیر شیخ کا '' مفتی کے افسانے''، ڈاکٹر سعادت سعید کا '' میجک ریالزم اور شخصیت نگاری''، امتیاز احمد کا '' علی پور کا ایلی سے لکھ نگری تک''، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا '' ممتاز مفتی'' اور راشدہ قاضی کا '' ممتاز مفتی : ایک مطالعہ'' قابلِ تعریف مضامین ہیں ۔ ہر نقاد نے ممتاز مفتی کی شخصیت اور فن پر الگ الگ پہلوؤں سے بات کی ، اس طرح ممتاز مفتی کی شخصی اور فنی ہمہ جہتی اجاگر ہوتی ہے۔ مثلاً منشا یاد ، ممتاز مفتی کے افسانوں سے متعلق اس اہم رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ :

'' ممتاز مفتی کا فن کردار کے نفسیاتی مطالعے اور اُس کی تحلیلِ نفسی کے ذریعے سچ کی دریافت کرتا ہے۔ حقیقت نگاری ، اس واقعیت نگاری یا حقیقت پسندی سے بالکل مختلف ہے جو ترقی پسند افسانے کی اساس سمجھی جاتی تھی ۔''(۷۲)

جیلانی کامران جو تنقید کا ایک اہم نام ہیں مگر انہوں نے فکشن یا افسانہ پر کافی کم لکھا، انہوں نے بھی ممتاز مفتی کے افسانوں پر بڑی عمیق اور گہری رائے دی ہے۔ وہ ممتاز مفتی کی کہانی کا ایک فن یہ مانتے ہیں کہ اُن کی کہانی ہر گھر کی کہانی بن جاتی ہے جس میں انسانی رشتوں کی مہک اور آنچ صاف محسوس کی جا سکتی ہے ۔ واقعی اگر ہم ممتاز مفتی کے افسانوں کو دیکھیں تو یہ بات ظاہر ہے کہ وہ ایک گھر اور اُس گھر کے اندر انسانی رشتوں کو بیان کرنے میں قدرتی مہارت رکھتے ہیں ۔ بہر حال جیلانی کامران نے اُن کے افسانوں کے بارے میں ایک اور بڑی اہم بات کہی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''ممتاز مفتی کا رویہ محبت کی میٹافزکس کی پہچان کا رویہ ہے ۔ ان کی کہانیوں کی منطق اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ محبت کا اصول اپنے مزاج کی مدد سے مرد اور عورت کے درمیان مساوات اور برابری کو قائم کرتا ہے ۔''(۷۴)

ڈاکٹر سعادت سعید ہمیشہ الگ طریقے سے تنقید کرتے ہیں اور نیا تنقیدی موضوع بڑے علمی دبدبے اور رعب سے پیش کرتے ہیں ۔ ممتاز مفتی کے فن اور اُن کی شخصیت نگاری کے حوالے سے بھی ڈاکٹر سعادت سعید نے نئے پہلو سے بات کی ہے ۔ اُس وقت تک اُردو میں میجک ریالزم کے بارے میں گفتگو عام نہیں تھی جب ڈاکٹر سعادت سعید نے بڑے اعتماد سے ممتاز مفتی کی شخصیت نگاری کے حوالے سے اسے موضوع بحث بنا لیا۔ اپنے اس مضمون میں لکھتے ہیں :

> ''عجیب اور نرالے کی تلاش انہیں بے قرار رکھتی ہے۔ وہ سماجی کاٹھ کباڑ میں سے کردار منتخب کرتے انہیں ایسا چوکھا رنگ دیتے ہیں کہ وہ بیش قیمت ہو جاتے ہیں ۔ شعور خیز کشادگی کے حامل موضوعات کا انتخاب آج بھی ان (ممتاز مفتی) کا وطیرہ ہے ۔''(۷۵)

ممتاز مفتی کا افسانہ'' آپا'' جہاں اُن کی افسانہ نگاری کی پہچان بنا، اُسی طرح ناول نگاری میں ''علی پور کا ایلی'' اُن کا بحث طلب ناول ثابت ہوا ۔ اُردو میں اس ناول پر بہت سے ناقدین نے اپنا اپنا اظہار کیا اور یہ اُن ناولوں میں شامل ہوا جن پر بے بہا بحثیں ہوئیں ۔ امتیاز احمد نے یہاں لکھا کہ:

''بہ حیثیت ناول اس میں ماورائی قوتوں کی کارفرمائی سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ناول کی صنف اس کی متحمل ہوسکتی ہے ؟ ایک ایسی صنف کو جسے جدید دور کا رزمیہ کہا گیا ہے، مافوق الفطرت عناصر کس حد تک راس آ سکتے ہیں ؟''(۷۶)

''سپوتنک'' کا ڈاکٹر رشید امجد نمبر ، ڈاکٹر اسد فیض کا ایک اور کارنامہ ہے۔ یہ بھی ایک بھر پور کتاب مرتب ہوئی ۔ بعد مین جب ڈاکٹر شفیق انجم نے '' رشید امجد: ایک مطالعہ'' کتاب مرتب کی تو ڈاکٹر اسد فیض کے اس نمبر سے تمام تنقیدی مضامین اپنی کتاب میں شامل کر لیے۔ (۷۷)

اس شمارہ میں حسبِ روایت سب سے پہلے رشید امجد سے ڈاکٹر اسد فیض کا ادبی مکالمہ شامل ہے۔ اُس کے بعد ڈاکٹر انور زاہدی کا مضمون''رشید امجد گمشدہ راستے کا دشت نورد''، ڈاکٹر مجید مضمر کا مضمون'' رشید امجد کی افسانہ نگاری'' ، احمد جاوید کا مضمون ''رشید امجد کا فنی سفر''، مہدی جعفر کا '' رشید امجد کی کائنات''، مظہر جمیل کا '' رشید امجد کے افسانے'' اور ڈاکٹر نوازش علی کا مضمون رشید امجد کے افسانوں کی اسلوبیاتی اساس'' شامل ہیں ۔ علاوہ ازیں ممتاز مفتی کا خاکہ'' مجاہد ہاتو'' کی صورت موجو ہے اور آخر میں رشید امجد کے چند بہترین افسانوں کا انتخاب اس خصوصی شمارہ کی زینت ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد سے ڈاکٹر اسد فیض کا مکالمہ انتہائی جان دار ہے ۔ یہاں بھی انہوں نے اپنے سوالات سے پوری ادبی اور فکری روایت کو منظر پر لانے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد دراصل جدید اُردو افسانہ کا ایک اہم نام ہیں ۔ اس لیے ڈاکٹر اسد فیض نے اسی مناسبت سے سوال کیے ہیں ۔مثلاً ایک اہم سوال یہ کہ'' کیا اب جدید افسانہ دم توڑ گیا ہے؟'' کے جواب میں رشید امجد کہتے ہیں کہ :

''نہیں یہ بات نہیں ہے ۔ بات یہ ہے کہ ساٹھ کی دہائی میں جو جدید

افسانہ ہم نے شروع کیا تھا، اب اس میں ایک نفاست اور ٹھہراؤ آ گیا ہے۔۔۔۔ جس طرح ابتدا میں ہر نیا فیشن اجنبی ہوتا ہے لیکن جب ہم عادی ہو جاتے ہیں تو سب اُسے اپنا لیتے ہیں کچھ ایسا ہی معاملہ جدید اُردو افسانے کا بھی ہے۔ اس لیے کہ ہر جدت ایک عرصے کے بعد روایت کا حصہ بن جاتی ہے۔''(۷۸)

تنقید کے بارے میں ڈاکٹر رشید امجد کے خیالات بڑے متوازن ہیں ۔ اُن کے خیال میں تنقید کو برداشت کرنے کا مادہ ہم میں نہیں اور اس کی وجہ ملوکیت کا وہ نظام ہے جس کے تحت ہماری پرورش ہوئی ہے۔ دوسرا ہمارے ہاں تنقیدی نظریات ہمارے اپنے ادب میں سے اخذ نہیں ہو سکے بلکہ یہ باہر سے آتے ہیں جس کی وجہ سے صحیح تنقیدی پیمانے وجود میں نہیں آتے۔

اُن کی افسانہ نگاری پر ، جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں ، بیش تر ناقدین نے اظہارِ خیال کیا ہے اور بڑی اہم اہم آرا دی ہیں جس سے اس عہد کے ایک اہم ترین افسانہ نگار کی افسانہ نگاری کے اسرار و رموز سمجھنے میں معاونت ملتی ہے ۔ اس ضمن میں احمد جاوید کی ایک رائے بڑی معنی خیز ہے ۔ وہ خود بھی جدید اُردو افسانہ کا ایک اہم نام ہیں ، اس لیے اُن کی رائے کی اہمیت اس حوالے سے زیادہ بنتی ہے ۔ وہ رشید امجد کے افسانوں پر لکھتے ہیں کہ :

''رشید امجد کے فن میں ٹھہراؤ نہیں ہے بلکہ ایک مسلسل ارتقا ہے جو اس کے اسلوب میں جاری ہے اور اس کے موضوعات میں بھی ۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ بنیادی طور پر وہ شہری زندگی کے بکھیڑوں سے کہانیاں چنتا ہے مگر ادھر کچھ عرصے سے اس کے اس منطقے میں بھی قدرے تبدیلی ہوئی ہے ۔''(۷۹)

اس خصوصی نمبر کی ایک خاص بات پاکستان کے علاوہ ہندوستان کے ناقدین کی شمولیت بھی ہے ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں ہمارے جدید افسانہ نگاروں بالخصوص ڈاکٹر رشید امجد کے بارے میں کیا سوچا اور

محسوس کیا جا رہا ہے ۔ ہندوستان کے ایک اہم نقاد جو جدید اُردو افسانہ پر بے شمار تنقیدی مضامین اور کتابیں لکھ چکے ہیں ، مہدی جعفر ، انہوں نے رشید امجد کی افسانوی کائنات کو ایک اور ہی زاویہ سے دیکھا ہے۔ وہ اس ضمن میں رقم طراز ہیں کہ :

'' معنوی بصارت سے کائناتی بصیرت کے جنم لینے کا منظر رشید امجد کی افسانوی زبان کا امتیازی وصف ہے۔ اُن کی پہچان وہ کاوش ہے جو بنے بنائے اور فرسودہ لسانی ڈھانچوں کو ایک ارفعٰ جمالیاتی سطح پر لے جا کر بدل ڈالنا چاہتی ہے ۔''(۸۰)

ممتاز مفتی نے رشید امجد کو ''مجاہد ہاتو'' کہا ہے۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں رشید امجد کا ایک ایسا خاکہ کھینچا ہے جس میں رشید امجد کی شخصیت ، اُن کی زندگی اور اُن کا فن سب کے سب آ گئے ہیں ۔ وہ رشید امجد کو ایسا مجاہد بتاتے ہیں جو **The Land of no Return** سے واپس آ گیا ہے اور یہ اعزاز ہر کسی کونہیں ، کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے ۔ ممتاز مفتی لکھتے ہیں :

'' سہہ جانے کی طاقت افضل تر ہے چوں کہ وہ ۔۔۔۔۔ نامساعد حالات میں جینے کا حوصلہ بخشتی ہے۔ ۔۔۔ اس حوالے سے رشید امجد ایک ہاتو ہے مجاہد ہاتو ، رشید امجد کی زندگی 'ہونی ' کے تحت گزری ہے۔''(۸۱)

رشید امجد کے افسانوں کا انتخاب بھی ڈاکٹر اسد فیض کے تنقیدی شعور کا ایک بے مثل اظہاریہ ہے۔ انہوں نے یہاں وہی افسانے پیش کیے ہیں جو بلا شبہ رشید امجد کے فن اور فکر کی بھر پور نمائندگی کرتے ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'سپوتنک' کا یہ شمارہ بھی ڈاکٹر اسد فیض کی مدیرانہ صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

''سپوتنک'' کا اگلا خصوصی اور اہم نمبر ڈاکٹر اسد فیض نے رفیق چوہدری کی تخلیقات سے ترتیب دیا۔

اس میں رفیق چوہدری کے پانچ افسانے ، ایک تنقیدی مضمون ، ایک خاکہ اور ایک پاک بھارت جنگ ۱۹۶۵ء پر لکھا جانے والا رفیق چوہدری کا پہلا ناول '' واہگہ کے اُس پار'' شامل ہے ۔ ان تخلیقات کے علاوہ رفیق چوہدری سے ڈاکٹر اسد فیض کا مکالمہ جو'' دید بان'' میں شائع ہو چکا تھا، ایک شخصی مضمون اور جمیل ملک کی رفیق چوہدری کے نام ایک نظم بھی شامل ہے ۔

رفیق چوہدری سے ڈاکٹر اسد فیض کے مکالمہ کا ذکر گزشتہ اوراق میں ہو چکا ہے لہٰذا ہم ڈاکٹر اسد فیض کے اُس مضمون کی طرف آتے ہیں جو'' رفیق چوہدری ۔ عصرِ حاضر کا ایک نیک نام ادیب'' کے عنوان سے شامل ہے ۔ اور جو اس سے پہلے قومی زبان کے اکتوبر ۱۹۹۷ء کی اشاعت میں '' لو کہانی ختم ہوئی /رفیق چوہدری : عصرِ حاضر کا ایک نیک نام ادیب'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا ۔ یہ مضمون اصل میں رفیق چوہدری کے انتقال کے بعد لکھا گیا تھا ۔ اس مضمون کا اختتام ڈاکٹر اسد فیض کے ان الفاظ میں ہوتا ہے :

> ''رفیق چوہدری کا بنیادی آدرش آزادی تھا ۔ لکھنے ،پڑھنے ، بولنے اور اپنے نظریۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی اور یہی نصب العین اُن کی مختلف تخلیقات میں بار بار مختلف روپ میں ظاہر ہوا ہے رفیق چوہدری کی موت ایک شخصیت کی نہیں ایک عصر اور ترقی پسند تحریک کے ایک عہد کے ختم ہو جانے کا نام ہے۔'' (۸۲)

جمیل ملک کی انتہائی پر سوز نظم '' بازگشت'' جو رفیق چوہدری کے لیے لکھی گئی ہے ، ہماری توجہ کو اپنی طرف مبذول کرواتی ہے ۔ اس میں رفیق چوہدری سے بچھڑنے کا غم چھلکتا ہے اور اُسی کے ساتھ دیگر احباب کی دائمی جدائی کا دکھ بھی تازہ ہوتا نظر آتا ہے ۔ پر تاثیر اشعار کا مجموعہ ، یہ نظم ، ایک عمدہ مرثیہ ہے ۔ دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

''سب کا ہے تو رفیق ، مرا ہم سفر بھی ہے
جو تیری رہگزر ہے مری رہگزر بھی ہے

چل چل کے جس پہ آبلے پاؤں میں پڑ گئے
کتنے ہی ہم سفر تھے جو ہم سے بچھڑ گئے ۔''(۸۳)

رفیق چوہدری نے بہت سے افسانے لکھے مگر ایک ایسا ناول بھی لکھا جو اب پاک بھارت جنگ ۱۹۶۵ء پر لکھا جانے والا اُردو کا پہلا ناول مانا جاتا ہے۔'' واہگہ کے اُس پار'' کو یہ اعزاز حاصل ہوا۔ اس ناول کی اہم خوبی بقول سید سبط الحسن ضیغم یہ ہے کہ'' اُس نے حقائق کو مسخ نہیں کیا، تعصب کو قریب آنے سے روکا ہے اور ٹھوس فن کارانہ انداز میں اس تہذیبی ٹکراؤ کو مادی جدلیات کے آئینے میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے ۔'' (۸۴) یہی اس ناول کی خوبی ہے کیوں کہ اس موضوع پر تعصّبات کے بغیر لکھنا اور حقائق کو مسخ کیے بغیر لکھنا ایک مشکل کام ہے ۔ یہ ناول فنی پختگی کا بھی حامل ہے اسی لیے احمد ندیم قاسمی اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ :

''پاک بھارت جنگ کے پس منظر میں یہ پہلا ناول ہے جو اُردو میں لکھا گیا ہے۔ یہ اولیت اس وقت تک اعزاز نہیں بن سکتی جب تک ناول فنی لحاظ سے کامیاب نہ ہو ۔ رفیق چوہدری کا یہ ناول صحیح معنوں میں ناول ہے اس لیے اُسے اس اولیت پر فخر کرنے کا بھی حق حاصل ہے ۔'' (۸۵)

اس خصوصی نمبر کو مرتب کر کے ڈاکٹر اسد فیض نے بلا شبہ رفیق چوہدری جیسے ادیب کو بہ خوبی خراجِ تحسین پیش کیا ہے ۔

ڈاکٹر اسد فیض کی ایک کتاب'' اُردو تحقیق : مسائل و رفتار'' کو ایک معتبر کوشش قرار دیا جا سکتا ہے ۔ یہ کتاب اصل میں'' ہم عصر'' کا'' جامعاتی تحقیق نمبر'' کی کتابی صورت ہے ۔ اس میں مختلف ناقدین اور محققین کے تحقیق کے موضوع پر عالمانہ اور محققانہ مضامین شامل ہیں ۔ جو اُردو میں ہونے والی تحقیق کا منظر نامہ ہی مرتب نہیں کرتے بلکہ اس کی رفتار کا تعین کرنے میں بھی مدد گار ہیں ۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی کا مضمون'' اُردو تحقیق کا المیہ'' اس کتاب کی پہلی اہم تحریر ہے ۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی مجموعی طور پر موجودہ معیار سے مطمئن نہیں ۔ ان کے نزدیک تحقیق کے نام پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ محض کاغذوں کو'' کالا'' کرنے کے مترادف ہے ۔(۸۶) بنیادی طور پر وہ سندی تحقیق کی کمزوریوں کا ذمہ دار یونیورسٹیوں کے اُن پروفیسروں کو گردانتے ہیں جو طلبہ کے نگران مقرر کیے جاتے ہیں ۔

ڈاکٹر نثار احمد کا مقالہ'' شخصیات پر تحقیقی مقالہ اور تحقیقی تقاضے'' ایک متوازن اور تحقیق کے اصولوں پر پورا اترنے والا مضمون ہے ۔ انہوں نے تحقیقی مقالہ جات کو جن سات گروپوں میں تقسیم کیا ہے اُن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے :

''۱۔ لسانی مقالے　　۲۔ علاقائی مقالے　　۳۔شخصی مقالے
۴۔تصنیفی مقالے　　۵۔نظریاتی مقالے　　۶۔صنفی مقالے
۷۔مجلّاتی تحقیقی مقالے''　(۸۷)

اس کے بعد ان گروپوں کی مختصر وضاحت پیش کی ہے اور پھر شخصی مقالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ۔ ان کے خیال میں'' موجودہ ادبی تحقیق کا تقریباً سترفی صد شخصیتی مقالات پر مبنی ہے''۔(۸۸) اُن کے نزدیک استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر باقی کو کسی صورت بھی معیاری تحقیق کا نمونہ قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے اس کے اسباب بھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

''ڈاکٹر سلیم اختر سے ایک ادبی مکالمہ''اس کتاب میں ڈاکٹر اسد فیض کا ایک اہم معرکہ ہے۔ تحقیق اور تنقید کی صورتِ حال پر ڈاکٹر اسد فیض کے چبھتے ہوئے سوال اور ڈاکٹر سلیم اختر کے کھرے کھرے جواب تحقیق و تنقید کا موجودہ منظر نامہ ، نہایت خوبی سے مرتب کرتے ہیں ۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے خیال میں ''سندی تحقیقات میں معیار کے گرنے کی سب سے بڑی وجہ تحقیق سے وابستہ مالی فائدہ ہے ۔''(۸۹) وہ تحقیق کے مراحل میں انتظامی رکاوٹوں کے شدید مخالف ہیں ۔

کتاب کا سب سے اہم مضمون ڈاکٹر رفیق الدین ہاشمی کا '' پاکستانی جامعات میں ادبی تحقیق'' کہا جا سکتا ہے ۔ اس تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ اُن مسائل کو موضوع بناتی ہے جو تحقیق میں آج کل درپیش ہیں اور ہر جگہ ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں ۔ یہ مقالہ بلا شبہ تحقیق کے جدید مسائل کا حقیقت پسندانہ تجزیہ

کرتا ہے ۔ بقول ڈاکٹر رفیق الدین ہاشمی :

'' ادبیات میں تحقیقی کام کا تقریباً ۸۰ فی صد حصہ جامعات کے طلبہ اور اساتذہ کی کاوشوں پر مشتمل ہے ۔ تاہم بڑے محققین جیسے مولوی شفیع ، حافظ محمود شیرانی ، عبدالعزیز میمن ، سید عبداللہ ، غلام مصطفیٰ خان اور وحید احمد قریشی وغیرہ سے جامعات محروم ہونے کی وجہ سے اب جامعات میں تحقیق کی روایت روبہ زوال ہے ۔''(۹۰)

مجموعی طور پر تحقیق کے موضوع پر یہ کتاب ڈاکٹر اسد فیض کی ایک اہم پیش رفت ہے ۔ جس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ۔

اس کے علاوہ ان کی ایک کتاب '' اعتبارِ حرف '' بھی قابلِ ذکر ہے ، جس میں ڈاکٹر اسد فیض نے ڈاکٹر طاہر تونسوی کے مضامین کا انتخاب مرتب کیا ہے ۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی اُردو تنقید اور تحقیق کا ایک اہم نام ہیں ۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے سو سے اوپر مقالات لکھ رکھے ہیں ۔ ڈاکٹر اسد فیض نے اس کتاب میں اُن کے صرف اٹھارہ مضامین کا انتخاب کیا ہے ۔ اس ضمن میں اُن کا کہنا ہے کہ :

''اتنے بہت سے مضامین میں سے صرف اٹھارہ مضامین کا انتخاب سے مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کے باقی مقالات و مضامین اس پائے کے نہیں ، انتخاب ، انتخاب ہوتا ہے مرتبے میں سب برابر ہیں ۔''(۹۱)

فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے مضامین کی شکل میں سندھی ، اُردو، سرائیکی کے مشاہیر پر اظہارِ خیال کیا ہے جن میں شاہ عبداللطیف بھٹائی ، سچل سرمست (سندھی)، خواجہ فرید (سرائیکی) نمایاں ہیں ۔

اُردو کے جن قدیم و جدید مشاہیر کو ڈاکٹر طاہر تونسوی دائرۂ تنقید میں لائے ہیں اُن میں غالبؔ،

سرسید، نیاز فتح پوری ، جوش ملیح آبادی ،مسعود حسن رضوی ، ڈاکٹر سلیم اختر، مجید امجد، ظہور نظر، شیر افضل جعفری اور قتیل شفائی جیسے لوگ شامل ہیں ۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی نے اپنے پی ایچ ڈی کے موضوع کے لیے مشہور محقق مسعود حسین رضوی کا انتخاب کیا جو اس بات پر دال ہے کہ اُن کی طبیعت انفرادیت پسند ہے ۔ بلا شبہ مزاج کی اس انفرادیت نے انہیں تحقیق کے سلسلے میں ملتان سے لکھنو پہنچایا۔ لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر طاہر تونسوی نے خوش اسلوبی سے اس کڑے مرحلے کوا پنے لیے سبک بنایا او رصاحبانِ نظر سے داد تحسین بھی حاصل کی ۔ ڈاکٹر اسد فیض کی اس کتاب سے متعلق ادیب سہیل رائے دیتے ہیں کہ :

> ’’کتاب کے مرتب ڈاکٹر اسد فیض ادب کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔ انہوں نے معروف نقاد جناب شہزاد منظر پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا ہے ۔ اُن کی تنقید کے موضوع پر بھی دیگر کتابیں بازارِ ادب میں ہیں ۔ ادب کے باب میں بہت فعال شخصیت ہیں ، مستقبل میں اُن سے بہت سی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔‘‘(۹۲)

جیسا کہ ذکر ہوا کہ ڈاکٹر اسد فیض نے شہزاد منظر پر پی ایچ ڈی کر رکھی ہے اس لیے وہ اپنے اس موضوع سے ہر وقت اپنا رابطہ بحال رکھتے ہیں ۔ گاہے گاہے وہ شہزاد منظر سے متعلق اپنی نگارشات پیش کرتے رہتے ہیں ۔ حال ہی میں انہوں نے شہزاد منظر کے چند اہم مضامین کو’’ پاکستان مین اُردو ادب کی صورتِ حال‘‘ کے عنوان سے بھی مرتب کیا ہے۔ پانچ مقالات کا یہ مجموعہ ایک بھر پور کتاب ہے جس میں آزادی کے بعد پاکستان میں اُردو افسانہ ، ناول ، غزل اور تنقید کا مفصل جائزہ پیش کیا گیا ہے ۔ ہر صنف پر الگ الگ باب (مضمون) باندھا گیا ہے ۔شہزاد منظر کا عمیق تجزیہ اور گہرا مطالعہ ہر مضمون سے عیاں ہے ۔مضامین کے اس مجموعے سے متعلق ڈاکٹر اسد فیض لکھتے ہیں :

> ’’ شہزاد منظر نے نصف صدی پر مشتمل پاکستانی ادب کا محاکمہ نہایت دل سوزی اور جاں فشانی سے تحریر کیا ہے ۔ تما م اصناف پر اُن کے یہ

> مضامین تجزیاتی اورغیر جانبداری کا عمدہ نقش ہیں ۔ ان مضامین کے
> بین السطور شہزاد منظر کے گہرے مطالعہ اور موضوعات سے دلچسپی
> کا احساس بھی قاری کے مطالعہ کو شاد کام کرتا ہے ۔ عصرِ حاضر میں
> بہت کم ناقدین اتنی یک سوئی اور توجہ کا ذوق رکھتے ہیں۔ ان
> مضامین کی اشاعت اُردو کے ایک اہم نقاد کو خراجِ تحسین پیش کرنے
> کی ایک سعی ہے ۔''(۹۳)

اس مطالعہ سے ہم پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر اسد فیض کا تحقیقی میدان بلاشبہ بہت وسیع ہے۔ اُن کی دلچسپی تحقیق کے ضمن میں قابلِ داد ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ جزو وقتی نہیں بلکہ کُل وقتی محقق ہیں جو انتہائی خوش آئند بات ہے کیوں کہ پاکستان میں کسی کُل وقتی محقق کا ہونا کسی معجزے سے کم نہیں۔

حوالہ جات

۱۔بحوالہ اسد فیض ، ڈاکٹر: '' ادبی نوادرات''،مشمولہ '' قومی زبان''،کراچی،مئی ۲۰۱۱ء،ص۶۴

۲۔ایضاً،ص:۶۴

۳۔ایضاً،ص:۶۵

۴۔ایضاً،ص:۶۵ تا ۶۶

۵۔ایضاً،ص۶۶

۶۔اسد فیض ،ڈاکٹر:'' مشاہیر کے خطوط''،مشمولہ '' قومی زبان''،کراچی ، جولائی ۲۰۱۵ء،ص:۴۷

۷۔ایضاً،ص:۴۷

۸۔ایضاً،ص:۵۲

۹۔روبینہ شاہین،ڈاکٹر:'' مکاتیب : ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بنام ڈاکٹر اسد فیض''، مشمولہ:'' خیابان'' جامعہ پشاور،۲۰۱۳ء،ص:۱۳۹ تا ۱۵۴

۱۰۔اسد فیض، ڈاکٹر:'' ممتاز مفتی کے خطوط''،مشمولہ :ماہنامہ''نیرنگِ خیال''،راولپنڈی ، جولائی ۲۰۱۳ء، ص:۹

۱۱۔ایضاً،ص:۶ تا ۷

۱۲۔طاہر مسعود،ڈاکٹر:''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے'' کراچی ، اکادمی بازیافت ،۲۰۰۷ء،ص:۱۲

۱۳۔محمد علی صدیقی،ڈاکٹر،(فلیپ)،مشمولہ '' اندازِ گفتگو'' ازحسن رضوی، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء

۱۴۔اسد فیض، ڈاکٹر:'' دید بان''، ملتان ، ہم عصر پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص:۹

۱۵۔ضمیر جعفری ، سید : (آرا)، مشمولہ '' علی پور کا ایلی'' از ممتاز مفتی ، لاہور، الفیصل، ۲۰۰۷ء، ص، ۱۰

۱۶۔بحوالہ نجیبہ عارف، ڈاکٹر: '' ممتاز مفتی : شخصیت اور فن''، اسلام آباد ، اکادمی ادبیات پاکستان ، ۲۰۰۷ء، ص: ۱۵۸

۱۷۔''دید بان''، ص:۱۶

۱۸۔ایضاً، ص:۱۷

۱۹۔ایضاً، ص۲۴ تا ۲۵

۲۰۔انوار احمد،ڈاکٹر:'' اُردو افسانہ :ایک صدی کا قصہ''،فیصل آباد، مثال پبلشرز،۲۰۱۰ء،ص:۲۱۲

۲۱۔''دید بان''، ص:۳۰ تا ۳۱

۲۲۔ایضاً، ص:۲۹

۲۳۔ایضاً، ص:۳۲

۲۴۔نظیر صدیقی :(آرا)، مشمولہ'' شہزاد منظر:فن اور شخصیت''، مرتبین : علی حید ر ملک، صبا اکرام، کراچی ،فکشن گروپ پبلی کیشنز،۱۹۹۶ء،ص:۵۷

۲۵۔ایم ۔خالد فیاض:''جدید اُردو افسانے کے مباحث''،مشمولہ :'' الماس''، شمارہ نمبر۱۶،شاہ عبدالطیف یونیورسٹی خیر پور سندھ، ۲۰۱۵ء،ص:۱۶۷

۲۶۔''دیدبان'' ص:۳۷

۲۷۔ایضاً، ص:۳۴ تا ۳۵

۲۸۔ایضاً، ص:۳۸

۲۹۔علی حیدر ملک:''شہزاد منظر:فن اور شخصیت''،ص:۲۵

۳۰۔''دید بان''، ص:۴۴ تا ۴۵

۳۱۔ایضاً، ص:۵۰

۳۲۔ایضاً، ص:۵۰

۳۳۔اے بی اشرف، ڈاکٹر:'' ارشد ملتانی ۔شعورِ زیست کا شاعر''،مشمولہ :'' ارشد ملتانی ''، مرتب : عمر کمال خان ایڈووکیٹ، ملتان ، بزمِ ثقافت ، ۲۰۰۶ء،ص:۲۲

۳۴۔ایم۔ خالد فیاض:'' ارشد ملتانی اور زندگی ''، مشمولہ'' ارشد ملتانی : فن اور شخصیت''، مرتب : مشتاق کھوکھر، ملتان ،مقصودہ بیگم میموریل ادبی سنگت ، ۲۰۰۸ء،ص:۲۰۸

۳۵۔’’دید بان‘‘، ص:۵۵

۳۶۔ایضاً، ص:۵۴

۳۷۔ایضاً، ص:۵۵ تا ۵۶

۳۸۔ایضاً، ص:۶۰

۳۹۔انوار احمد، ڈاکٹر:’’ اُردو افسانہ : ایک صدی کا قصہ‘‘،ص:۵۳۷

۴۰۔’’دید بان‘‘، ص:۶۶

۴۱۔ایضاً، ص:۶۸

۴۲۔مختار ظفر:(دیباچہ)، مشمولہ’’ شعرو فکرِ اقبال‘‘،از ڈاکٹر اسلم انصاری، ملتان ،مجلسِ فکرِ اقبال، ۱۹۹۹ء،ص:۱۱

۴۳۔’’دید بان‘‘، ص:۷۳

۴۴۔ایضاً، ص:۷۷

۴۵۔منیر الحق کعبی ، پروفیسر’’مکالماتِ شاہین‘‘، گجرات، زجاج،۲۰۱۱ء،ص:۷

۴۶۔’’دید بان‘‘، ص:۸۰

۴۷۔ایضاً، ص:۸۰

۴۸۔توشی کاروایسو مورا:’’کچھ میری رائے میں‘‘،مشمولہ’’بارش میں بھیگتے زرد پتے‘‘ از ڈاکٹر محمد امین، ملتان ، دستک ، ۲۰۱۶ء،ص:۷

۴۹۔’’دید بان‘‘، ص:۸۷

۵۰۔ایضاً، ص:۹۲ تا ۹۳

۵۱۔بحوالہ’’ علی حیدر ملک‘‘،’’ اُن سے بات کریں‘‘، کراچی ، میڈیا گرافکس، ۲۰۰۹ء،ص:۱۴

۵۲۔گلزار جاوید:’’گوش بر آواز‘‘،راولپنڈی ، پاک لینڈ پرنٹرز، ۲۰۱۵ء،ص:۷

۵۳۔جاوید اصغر:’’ دید بان ‘‘ ،مشمولہ ماہنامہ ’’ اُردو بک ریویو‘‘ ، نئی دہلی ، نومبر دسمبر ۱۹۹۹ء، ص: ۲۸

۵۴۔غلام حسین ساجد :’’ اک کہانی ہے اہل دل کے لیے‘‘،مشمولہ’’ ہم عصر‘‘، ملتان ، جلد نمبر۲، شمارہ نمبر ۸ تا ۱۳، جنوری تا مارچ ۲۰۰۰ء،ص: ۵۸ تا ۵۹

۵۵۔محمد امین ، ڈاکٹر،'' تم کب آؤ گے''،مشمولہ : ایضاً،ص: ۷۱

۵۶۔ ایضاً، ص: ۷۲

۵۷۔اسد فیض،ڈاکٹر: '' پاکستان مین کتابوں کی اشاعت کے مسائل ''، مشمولہ : ایضاً ، ص :۱۰ تا ۱۱

۵۸۔ایضاً، '' ملتان کا ادبی منظر نامہ''، مشمولہ '' ہم عصر''، ملتان ، شمارہ نمبر ۵، جولائی ۲۰۰۲ء، ص: ۷

۵۹۔مختار ظفر، پروفیسر ، ڈاکٹر: '' ملتان کی شعری روایت'' مشمولہ : ایضاً ،ص: ۱۹

۶۰۔حمید الفت ملغانی : '' ملتان میں سرائیکی ادب''،مشمولہ : ایضاً،ص: ۲۰

۶۱۔ اسد فیض ، ڈاکٹر: '' ملتان میں اُردو کے ادبی جرائد''،مشمولہ : ایضاً،ص ۳۵

۶۲۔خرم خرام صدیقی :'' غزل''،مشمولہ : ایضاً ،ص : ۱۲۱

۶۳۔منیر تنہا:''غزل''،مشمولہ : ایضاً،ص:۱۱۷

۶۴۔ مظہر کلیم : '' انٹرویو'' مشمولہ : ایضاً ،س:۱۳۴

۶۵۔عامر سہیل ، سید : '' چند باتیں'' مشمولہ : '' انگارے''(لطیف الزماں خاں نمبر)، ملتان ، شمارہ نمبر ۱۷ تا ۲۷، نومبر ، دسمبر ۲۰۱۵ء،ص: ۷

۶۶۔ اسد فیض ،ڈاکٹر : '' لطیف الزماں خاں (پیدا کہاں اب ایسے پراگندہ طبع لوگ)، مشمولہ: قومی زبان ، کراچی ، جلد نمبر ۸۸، شمارہ نمبر ۷، جولائی ۲۰۱۶ء،ص:۳۲

۶۷۔لطیف الزماں خان:'' انٹرویو''،مشمولہ : '' ہم عصر'' ملتان ، جولائی ۲۰۰۲ء،ص :۱۲۷

۶۸۔عرش صدیقی:'' طاہر تونسوی ۔محقق و نقاد''، مشمولہ:''لمحہ موجود ، ادب اور ادیب'' از طاہر تونسوی، لاہور ، مقبول اکیڈمی ،۱۹۹۲ء،ص : ۱۷

۶۹۔ریاض احمد : '' دیباچہ''، مشمولہ''افکار و تجزیات'' از ڈاکٹر طاہر تونسوی ، لاہور ، ابلاغ پبلشرز ، ۲۰۰۲ء،ص:۲۰

۷۰۔طاہر تونسوی ، ڈاکٹر: ''انٹرویو''مشمولہ'' ہم عصر''، ملتان ، جلد نمبر۲، شمارہ نمبر۱۴ تا ۱۶ ، اپریل تا جون ۲۰۰۰ء،ص:۱۷۷ تا ۱۷۸

۷۱۔اسد فیض ، ڈاکٹر : '' اُردو ادب کا مہاتما بدھ''، مشمولہ''سپوتنک''، لاہور ، جلد نمبر ۱۶، شمارہ نمبر۱،

جنوری ۲۰۰۵ء ،ص: ۲۷

۷۲۔دیکھیے:'' عکسی مفتی '(مرتب)''مہا اوکھا مفتی ''، لاہور ، الفیصل ناشران، ۲۰۱۳ء، ص:۶۷ تا ۶۹

۷۳۔منشا یاد :''ممتاز مفتی بحثیت افسانہ گار''،مشمولہ'' سپوتنک''، جنوری ۲۰۰۵ء،ص: ۶۹

۷۴۔جیلانی کامران : '' ممتاز مفتی کے افسانے''،مشمولہ : ایضاً،ص: ۶۱

۷۵۔سعادت سعید ، ڈاکٹر:'' میجک ریالزم اور شخصیت نگاری''،مشمولہ ایضاً ،ص: ۸۲

۷۶۔امتیاز احمد :'' علی پور کا ایلی سے الکھ نگری تک''،مشمولہ ایضاً،ص: ۹۲

۷۷۔ دیکھیے :شفیق انجم ، ڈاکٹر :(مرتب) ''رشید امجد ۔ ایک مطالعہ''، راولپنڈی ،نقش گر، ۲۰۰۹ء، ص:۵

۷۸۔رشید امجد : (انٹرویو) ، مشمولہ'' سپوتنک''، لاہور ، جلد نمبر ۱۷، شمارہ نمبر ۵، مئی ۲۰۰۰ء، ص:۱۹

۷۹۔احمد جاوید :'' مجید امجد کا فنی سفر''،مشمولہ :ایضاً،ص: ۴۷

۸۰۔مہدی جعفر:''رشید امجد کی کائنات''، مشمولہ ،ایضاً ،ص:۵۴

۸۱۔ممتاز مفتی : مجاہد ہاتو''،مشمولہ ایضاً ،ص:۹۵ تا ۹۶

۸۲۔اسد فیض ، ڈاکٹر: '' لو کہانی ختم ہوئی /رفیق چوہدری ،''عہد حاضر کا ایک نیک نام ادیب''، مشمولہ قومی زبان ، کراچی ، اکتوبر ۱۹۹۷ء، ص:۷

۸۳۔جمیل ملک : '' باز گشت''(نظم) مشمولہ'' سپوتنک''، لاہور ، جلد نمبر ۱۴، شمارہ نمبر ۱۲، دسمبر ۲۰۰۳ء، ص: ۲۳

۸۴۔سبط الحسن ضیغم،سید:''رفیق چوہدری اور اس کا فن''،مشمولہ:ایضاً،ص:۸۰

۸۵۔احمد ندیم قاسمی:(پیش لفظ)،مشمولہ ایضاً،ص:۸۲

۸۶۔طاہر تونسوی ،ڈاکٹر:'' اُردو تحقیق کا المیہ''،مشمولہ :'' اُردو تحقیق : مسائل و رفتار''،مرتب : ڈاکٹر اسد فیض ، ملتان ، ہم عصر پبلی کیشنز ،۲۰۰۲ء، ص:۲۶

۸۷۔نثار احمد ، ڈاکٹر :'' شخصیات پر تحقیقی مقالہ اور تحقیقی تقاضے''،مشمولہ ایضاً ،ص: ۵۱

۸۸۔ایضاً، ص: ۵۲

۸۹۔سلیم اختر ، ڈاکٹر: '' انٹرویو''، مشمولہ ایضاً، ص: ۳۷
۹۰۔رفیع الدین ہاشمی ، ڈاکٹر: '' پاکستانی جامعات میں ادبی تحقیق ''، مشمولہ ایضاً، ص: ۱۰۱
۹۱۔اسد فیض ،ڈاکٹر : '' اعتبارِ حرف''فیصل آباد ، ایشیا پبلشرز ، ۲۰۰۵ء،ص:۶
۹۲۔ادیب سہیل : '' اعتبارِ حرف'' (تبصرہ)،مشمولہ : ''قومی زبان''، کراچی ، جلد نمبر ۷۸، شمارہ نمبر۳، مارچ ۲۰۰۶ء، ص: ۸۳
۹۳۔ اسد فیض ، ڈاکٹر ، (عرض مرتب)،مشمولہ'' پاکستان میں اُردو ادب کی صورتِ حال'' از شہزاد منظر، اسلام آباد ، پورب اکادمی ، ۲۰۱۴ء، ص:۶

ڈاکٹر اسد فیض اُردو کے ایک انتھک محقق ہیں۔ اُن کی اس خصوصیت پر اس لیے زور دینا ضروری ہے کہ آج کی ہماری تحقیق میں اسی ایک خصوصیت کی انتہائی کمی ہے جب کہ یہی وہ خصوصیت ہے کہ جس کے بغیر تحقیق کا تصور کرنا مشکل ہے۔

تحقیق؛ محقق سے محنت مانگتی ہے اور وہ بھی انتھک؛ اُس صبر کا تقاضا کرتی ہے جس کی حد طے نہیں ہوتی اور بقول ایم۔ خالد فیاض ''سچائی کا وہ معیار مانگتی ہے جو دنیا میں بالعموم اور ہمارے معاشرے میں بالخصوص نہیں رہا''۔(۱)

تحقیق کے لیے معروضی طور پر سچائی کو پہچاننے کی صلاحیت ضروری ہے جو ہر ایک محقق میں نہیں ہوتی۔ اُردو محققین کے ہاں یہ صلاحیت بہت کم پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسد فیض اُن معدودے چند محققین میں سے ہیں جن کے ہاں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ڈاکٹر اسد فیض میں تحقیق و تدوین سے متعلق وہ طبعی مناسبت پائی جاتی ہے جس کے بارے میں رشید حسن خان کا کہنا یہ ہے کہ:

> ''آدمی پڑھا لکھا ہو، محنتی ہو اور اس نے عمر کا بڑا حصہ تحقیق اور تدوین کی نذر کر دیا ہو؛ پھر بھی طبعی مناسبت اگر موجود نہیں تو وہ دونوں میں سے کسی کا حق ادا نہیں کر پائے گا اور مختلف قسم کی خامیاں اور ناتمامیاں بھیس بدل بدل کر اُس کی تحریروں میں نمایاں ہوتی رہیں گی۔''(۲)

ہم ڈاکٹر اسد فیض کے تحقیقی کارناموں کے بغور مطالعہ کے بعد اس بات کہ گواہی دے سکتے ہیں کہ اُن میں تحقیق و تدوین سے طبعی مناسبت کی کوئی کمی نہیں۔ یہ مطلوبہ مقدار میں زیادہ تو ہوسکتی ہے مگر ایک بوند بھی کم نہیں ہوسکتی۔

ڈاکٹر اسد فیض کے تحقیق کے میدان متنوع ہیں۔ اقبال شناسی، منٹو شناسی اور ملتان کی ادب شناسی اُن

کے واضح تحقیقی سروکار ہیں۔ علاوہ ازیں شہزاد منظر، مجید امجد، ممتاز مفتی، وزیر آغا جیسی شخصیات پر بھی وہ گاہے گاہے اپنی تحقیق کا نچوڑ پیش کرتے رہتے ہیں۔

بڑے تخلیق کاروں کے ایسے متون دریافت کرنے اور اُن کو تدوینی عمل سے گزار کر پیش کرنے میں ڈاکٹر اسد فیض کی دلچسپی خصوصی ہے جو کسی وجہ سے منظرِ عام پر آنے سے رہ گئے۔ اس ذیل میں سعادت حسن منٹو پر اُن کا کام انتہائی توجہ طلب ہے اور قابلِ تحسین بھی کہ اس کے ذریعے اُنہوں نے منٹو کے چند نایاب متون کو ادبی دنیا میں متعارف کرایا۔ ان میں کچھ متون ایسے بھی ہیں جو منٹو کی شناخت کو مزید مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کریں گے۔

منٹو کے ذیل میں ہمارے ہاں بہت سے محققین انکشاف و دریافت کا کاروبار کر رہے ہیں مگر ایسے محقق محض انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جو حقیقت میں منٹو کو دریافت کرنے کا لامتناہی سلسلہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ بلاشبہ منٹو کی سب کی سب تحریریں دریافت ہو جانے کا دعویٰ ابھی تک نہیں کیا جا سکا لہٰذا ڈاکٹر اسد فیض جیسے بے لوث اور محنتی محققین بغیر کسی لالچ یا ترغیب کے اس دریافت میں مقدور بھر حصہ ڈالتے رہتے ہیں جو منٹویات کے ذیل میں اہم اضافہ ہے۔ منٹو کے متون کی تدوین ضروری حواشی کے ساتھ کرنا ڈاکٹر اسد فیض انتہائی ضروری سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر اسد فیض نے منٹو کے علاوہ معروف اُردو شعرا کے بہت سے متون کو بھی دریافت کیا جن میں مجید امجد کی نظموں کے ایسے متون جنہیں شاید کچھ محققین نے صرف یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا کہ اُن سے شاعر کی شعری اہمیت کم ہوتی ہے، ڈاکٹر اسد فیض نے اس دلیل سے پیش کیا کہ یہ بھی بڑے شاعر کا کلام ہے اور اس سے صرفِ نظر کرنا درست نہیں۔

اقبالیات کے حوالے سے اُن کی تحقیق اقبال اور ملتان کی تنقیدی ادب پر محیط ہے۔ اُنہوں نے ''ملتان میں اقبال شناسی'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ان دونوں سے معاملہ کیا۔ اس مقالے کے مطالعہ سے ملتان میں اقبال کے حوالے سے تنقیدی فکر کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ہم ایک طرف یہ دیکھتے جاتے ہیں کہ اقبال کے تصورات کی تشریح کیسے کی گئی اور دوسری طرف یہ دیکھتے ہیں کہ ملتان میں ناقدین، اقبالیات کے ذیل میں کیا فکری رویہ رکھتے ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر اسد فیض کی یہ تحقیق اقبالیات اور ملتانیات، دو پہلوؤں سے کارگر ثابت ہوتی ہے۔

تحقیق پر بھی ڈاکٹر اسد فیض نے خصوصی توجہ کی اور ایک کتاب ایسے مقالات کی مرتب کی جس میں

اُردو میں ہونے والی تحقیق کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اسد فیض نہ صرف اُردو میں ہونے والی تحقیقی صورت حال سے پریشان ہیں بلکہ وہ اس کو بہتر بنانے کے لیے کوشاں بھی ہیں، جو کسی محقق کا بنیادی فرض بھی ہے۔

انٹرویو نگاری بھی اصل میں تحقیق کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ اس کے ذریعے تخلیق کاروں کے ذہن میں جھانکنے کا موقع ہاتھ آتا ہے اور اکثر اوقات تخلیق کے بنیادی سرچشموں پر روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر اسد فیض اس عمل کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ انٹرویو نگاری سے ہم تحقیق میں بہت مدد لے سکتے ہیں اسی لیے وہ انٹرویو نگاری کو مستقل اختیار کیے رکھتے ہیں۔ اور پھر یہ کہ انہیں اس بات کا پورا شعور ہے کہ کس طرح کے سوالات تحقیق کے مقاصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ ایسے ایسے سوالات کرتے ہیں جو ان تقاضوں کو پوری طرح پورا کرتے ہیں۔

اسی طرح ڈاکٹر اسد فیض مشاہیر کے خطوط کو بھی بڑی اہمیت دیتے ہیں اور انہیں بھی تحقیقی وسائل میں سے ایک گردانتے ہیں۔ بلاشبہ خطوط بھی ذہن کی فکری اپروچ کو لاشعوری طور پر ظاہر کرنے کا ایک اہم وسیلہ ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر اسد فیض اسے ایک تحقیقی فریضہ سمجھتے ہوئے مختلف مشاہیر کے خطوط کی تدوین و تحقیق کا کام بڑی دل جمعی سے کرتے ہیں۔

سب سے اہم بات یہ کہ اکثر صاحبان تحقیق کے جس موضوع میں پی۔ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرتے ہیں تاحیات اسی ایک موضوع سے اپنی تحقیق کو وابستہ رکھتے ہیں جو ایک حوالے سے بہتر بھی ہے اور ایک حوالے سے بہتر نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اس طرح وہ اپنی تحقیقی سرگرمیوں کا دائرہ کافی محدود کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر اسد فیض اس ضمن میں بھی بڑا متوازن رویہ رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے شہزاد منظر کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی مگر اسے پوری زندگی کے لیے اپنے پاؤں کی زنجیر نہیں بنایا۔ وہ اپنے اس موضوع سے وابستہ بھی رہے جس کا تازہ ثبوت اُن کی وہ کتاب ہے جس میں انہوں نے شہزاد منظر کی اُن تحریروں کو مدون کیا ہے جو اس سے پہلے کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئی تھیں، مگر انہوں نے اپنی تحقیق کو شہزاد منظر تک کبھی محدود نہیں رکھا۔ اُنہوں نے اور میدانوں میں بھی، جن کا ذکر ہم کر آئے ہیں، تحقیق کے جوہر دکھائے اور خود کو ان میدانوں کا شہسوار بھی ثابت کیا۔ خاص طور پر اقبالیات، ملتان کا ادب اور مثنویات کے ذیل میں اُن کی تحقیق کو معتبر نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

غرض یہ کہ اس وقت کی اُردو تحقیق و تدوین کے میدان میں ڈاکٹر اسد فیض کو ایک معتبر مقام حاصل

ہے اور وہ صرف اس لیے کہ اُن کا کام اس کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ جس لگن، محنت اور شوق کے ساتھ تحقیق اور تدوین کا مشکل عمل سرانجام دیتے ہیں وہ آج کے محققین میں عنقا ہوتا جا رہا ہے۔ بالخصوص تدوین کا کام کہ جو ''تحقیق سے آگے کی منزل ہے''(۳) اور بقول رشید حسن خان:

> ''جو شخص شرائطِ تحقیق کو پورا کرتا ہو اور ساتھ ہی اصولِ تدوین سے پوری طرح واقف ہو اور اُس کا تجربہ بھی رکھتا ہو، یا اس کو ایسی تربیت ملی ہو جو تجربے کا بدل ہو سکے؛ تو ایسا شخص تدوین کا کام انجام دے سکتا ہے۔''(۴)

ڈاکٹر اسد فیض کا تدوینی کام رشید حسن خان کے اس معیار پر بے شک پورا اترتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ایم۔ خالد فیاض: ''کیا جھوٹے معاشرے میں تحقیق ممکن ہے؟''، (غیر مطبوعہ مقالہ)، ص: ۴

۲۔ رشید حسن خان: ''ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ''، لاہور، نیو ایج پبلشرز، ۱۹۹۸ء، ص: ۵۸

۳۔ ایضاً، ص: ۶۱

۴۔ ایضاً، ص: ۶۱

کتابیات

کتب

۱۔آصف فرخی: (مرتب)،''منٹو کا آدمی نامہ''، کراچی، شہرزاد،۲۰۱۲ء

۲۔ابو بکر فاروقی، محمد:(مرتب)''انتون چیخوف:افسانے، ڈرامے اور تنقیدی مطالعے''، کراچی، ٹِک ٹائم ، ۲۰۱۵ء

۳۔اسد فیض ، ڈاکٹر ،'' ملتان میں اقبال شناسی''، اسلام آباد ،نیشنل بک فاؤنڈیشن ، ۱۹۹۹ء

۴۔اسد فیض ، ڈاکٹر:'' دید بان''، ملتان ، ہم عصر پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء

۵۔ اسد فیض، ڈاکٹر: (مرتب)،'' اُردو تحقیق : مسائل و رفتار''، ملتان ، ہم عصر پبلی کیشنز ،۲۰۰۲ء

۶۔اسد فیض ،ڈاکٹر :'' اعتبارِ حرف''فیصل آباد ، ایشیا پبلشرز ، ۲۰۰۵ء

۷۔ اسد فیض ، ڈاکٹر ، (مرتب)،'' پاکستان میں اُردو ادب کی صورتِ حال'' از شہزاد منظر، اسلام آباد ، پورب اکادمی ،۲۰۱۴ء

۸۔اسد فیض، ڈاکٹر:(مرتب)،'' منٹو کی گم شدہ تحریریں''، کراچی ،ظفر اکیڈمی ،۲۰۱۴ء

۹۔احمد سلیم : (مرتب)،'' روسی ادب کے شاہکار''، ترجمہ : سعادت حسن منٹو ، لاہور ، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۱۰۔ امین، محمد، ڈاکٹر:''بارش میں بھیگتے زرد پتے''، ملتان ، دستک ، ۲۰۱۶ء

۱۱۔ انور سدید ، ڈاکٹر :'' اُردو ادب کی مختصر تاریخ''، اسلام آباد ، مقتدرہ قومی زبان ، ۱۹۹۱ء

۱۲۔افتخار حسین شاہ ، پروفیسر :''اقبال اور پیروی شبلی'' ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء

۱۳۔اسلم انصاری ، ڈاکٹر :'' شعر وفکر اقبال'' ملتان ،مجلس فکر اقبال ، ۱۹۹۹ء

۱۴۔اسلم انصاری ، ڈاکٹر:''اقبال ۔ عہد آفرین''، ملتان ، کاروانِ ادب ، ۱۹۸۷ء

۱۵۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر:'' شعروفکرِ اقبال''، ملتان ،مجلسِ فکرِ اقبال، ۱۹۹۹ء

۱۶۔اے بی اشرف ، ڈاکٹر : غالب اور اقبال''، ملتان، بیکن بکس ، ۱۹۸۸ء

۱۷۔انوار احمد ،ڈاکٹر:''تحریک پاکستان میں علامہ اقبال کا کردار'' ، ملتان ، بیکن بکس، ۱۹۹۳ء

۱۸۔انوار احمد،ڈاکٹر:'' اُردو افسانہ :ایک صدی کا قصہ''،فیصل آباد، مثال پبلشرز،۲۰۱۰ء

۱۹۔ایس ایم منہاج الدین ، ڈاکٹر: '' افکار وتصوراتِ اقبال''، ملتان ، کاروانِ ادب ، ۱۹۸۵ء

۲۰۔ایس ایم منہاج الدین ، ڈاکٹر: ''افکارِ اقبال''، ملتان ، کاروانِ ادب ، ۱۹۸۹ء

۲۱۔پرویز انجم: ''منٹو۔غالبؔ کا پرستار''،فیصل آباد، مثال پبلشرز،۲۰۱۲ء

۲۲۔جابرعلی سید: '' اقبال کا فنی ارتقا''لاہور، بزمِ اقبال ، ۱۹۷۸ء

۲۳۔جابرعلی سید: '' اقبال ۔ ایک مطالعہ''، لاہور، بزمِ اقبال ، ۱۹۸۵ء

۲۴۔جنید امجد: (مرتب)،''صورتِ معنی،معنئ صورت''، فیصل آباد، مثال پبلشرز،۲۰۱۴ء

۲۵۔حسن رضوی: '' اندازِ گفتگو''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء

۲۶۔خالد ارمان : (مرتب):'' باقیاتِ منٹو'' لاہور ، نگارشات ،۲۰۰۶ء

۲۷۔خالد اشرف ،ڈاکٹر: '' افسانے منٹو کے اور پھر بیاں اپنا''، لاہور ، دستاویز،۲۰۱۳ء

۲۸۔دامودرگپت:''نگار خانہ''،مترجم : میرا جی ، لاہور ، بک ہوم ،۲۰۰۴ء

۲۹۔ رشید حسن خان: ''ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ''، لاہور، نیو ایج پبلشرز، ۱۹۹۸ء

۳۰۔رفیع الدین ہاشمی ، ڈاکٹر ، ۰ مرتب)،'' ۱۹۸۵ء کا اقبالیاتی ادب : ایک جائزہ'' ، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان ، ۱۹۸٦ء

۳۱۔روبینہ ترین ، ڈاکٹر : '' ملتان کی ادبی وتہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ'' ،ملتان ، بیکن بکس، ۱۹۸۹ء

۳۲۔ساجد ، عبدالمجید :'' اقبال : حیات عصر'' ، ملتان ، ادارہ تحقیق و ادب ،۱۹۹۴ء

۳۳۔سجاد حارث:'' ادب اور ریڈیکل جدیدیت''، لاہور، نگارشات ، ۱۹۸۸ء

۳۴۔شفیق انجم ، ڈاکٹر :(مرتب) ''رشید امجد ۔ ایک مطالعہ''، راولپنڈی ،نقش گر، ۲۰۰۹ء

۳۵۔طاہر تونسوی ، ڈاکٹر ،'' ملتان میں اُردو شاعری''، لاہور ، سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۴ء

۳٦۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر: ''لمحہ موجود ، ادب اور ادیب''، لاہور ،مقبول اکیڈمی ،۱۹۹۲ء

۳۷۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر: ''افکار و تجزیات'' ، لاہور ، ابلاغ پبلشرز ،۲۰۰۲ء

۳۸۔طاہرہ اقبال، ڈاکٹر: ''منٹو کا اسلوب: افسانوں کے حوالے سے''، لاہور،فکشن ہاؤس،۲۰۱۲ء

۳۹۔طاہر مسعود،ڈاکٹر:''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے'' کراچی ، اکادمی بازیافت ،۲۰۰۷ء

۴۰۔عاصی کرنالی : ''چراغِ نظر''، ملتان ، مکتبہ عاصی کرنالی ،۱۹۹۲ء

۴۱۔عامر سہیل، سید، ڈاکٹر:(مرتب) '' منٹو : کون ہے یہ گستاخ۔۔۔؟''، لاہور، پاکستان رائٹرز کواپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۵ء

۴۲۔عبدالرحمٰن ،منشی : '' اقبال اور مسٹر'' ، لاہور، گوشۂ ادب ، ۱۹۵۵ء

۴۳۔عبدالرحمٰن ،منشی : '' علامہ اقبال کی کردار کشی ''، ملتان ، جاوید اکیڈمی ، ۱۹۸۸ء

۴۴۔ عکسی مفتی: (مرتب)''مہا اوکھا مفتی''، لاہور ، الفیصل ناشران،۲۰۱۳ء

۴۵۔علی حید ر ملک، صبا اکرام: (مرتبین) '' شہزاد منظر:فن اور شخصیت''، کراچی ،فکشن گروپ پبلی کیشنز،۱۹۹۶ء

۴۶۔ علی حیدر ملک ،''اُن سے بات کریں''، کراچی ، میڈیا گرافکس، ۲۰۰۹ء

۴۷۔ عمر کمال خان ایڈووکیٹ: (مرتب) '' ارشد ملتانی ''، ملتان ، بزمِ ثقافت ، ۲۰۰۶ء

۴۸۔کرم الٰہی بدر : '' تاریخِ ملتان''، لاہور، رہبر ایجنسی،۱۹۷۸ء

۴۹۔گلزار جاوید:''گوش بر آواز''،راولپنڈی ، پاک لینڈ پرنٹرز، ۲۰۱۵ء

۵۰۔مبین مرزا: '' سعادت حسن منٹو: شخصیت اور فن''، اسلام آباد ، اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۸ء

۵۱۔محمد سعید : (مرتب)،'' نوادراتِ منٹو''، لاہور، ادارہ فروغ مطالعہ ، ۲۰۰۹ء

۵۲۔محمد مجیب : '' روسی ادب'' (جلد دوم)، کراچی ، انجمن ترقیٔ اُردو، پاکستان ،۱۹۹۲ء

۵۳۔ مشتاق کھوکھر: (مرتب) '' ارشد ملتانی : فن اور شخصیت''، ملتان ،مقصودہ بیگم میموریل ادبی سنگت، ۲۰۰۸ء

۵۴۔ممتاز شیریں : '' منٹو : نوری نہ ناری''، کراچی ، مکتبۂ اسلوب،۱۹۸۵ء

۵۵۔ممتاز مفتی:''ہند یاترا'' ، لاہور، الفیصل ناشران،۱۹۹۲ء

۵۶۔ممتا مفتی: '' علی پور کا ایلی''، لاہور، الفیصل ، ۲۰۰۷ء

۵۷۔منٹو، سعادت حسن:'' منٹو ڈرامے'' ، لاہور ، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء

۵۸۔منٹو، سعادت حسن : '' منٹو باقیات'' ،لاہور ، سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء

۵۹۔منٹو، سعادت حسن : '' منٹو کہانیاں''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز : ۲۰۰۴ء

۶۰۔منیر الحق کعبی ، پروفیسر،''مکالماتِ شاہین''، گجرات، زجاج،۲۰۱۱ء

۶۱۔ مہر عبد الحق ، ڈاکٹر : '' پیام فرید''، ملتان ، سرائیکی ادبی بورڈ، ۱۹۸۷ء
۶۲۔مہر،عبدالحق ، ڈاکٹر: '' جاوید نامہ اقبال'' ، ملتان ، سرائیکی ادبی بورڈ ،۱۹۷۴ء
۶۳۔ نجیبہ عارف، ڈاکٹر: '' ممتاز مفتی : شخصیت اور فن''، اسلام آباد ، اکادمی ادبیات پاکستان ، ۲۰۰۷ء
۶۴۔وارث علوی : '' منٹو : ایک مطالعہ''، اسلام آباد ،الحمرا،۲۰۰۳ء

ادبی جرائد

۱۔ اخبار اردو،ماہ نامہ اسلام آباد،جلد ۳۰،شمارہ نمبر۹،ستمبر ۲۰۱۲
۲۔'' اُردو بک ریویؤ' ، نئی دہلی ، جلد۴،شمارہ ۴۹۔۵۰، نومبر دسمبر ۱۹۹۹ء
۳۔ اردو دنیا،دہلی،جلد ۱۷،شمارہ نمبر ۸،اگست ۲۰۱۵ء،
۴۔ الحمرا،ماہ نامہ،لاہور ،جلد ۱۰،شمارہ نمبر ۹،ستمبر ۲۰۱۰ء
۵۔ الحمرا،ماہ نامہ،لاہور ،جلد ۱۰،شمارہ،۱۰،اکتوبر ۲۰۱۰ء
۶۔'' الماس''، شمارہ نمبر۱۶،شاہ عبدالطیف یونیورسٹی خیر پور سندھ، ۲۰۱۵ء
۷۔'' انگارے''(لطیف الزماں خاں نمبر)، ملتان ، شمارہ نمبر ۱۷ تا ۲۷، نومبر ، دسمبر ۲۰۱۵ء
۸۔'' اوراق'' ، لاہور، جلد نمبر۲۲، شمارہ نمبر ۱۱ تا ۱۲، نومبر دسمبر ۱۹۸۷ء
۹۔''ایکسپریس'' (روزنامہ)، اسلام آباد ،۲۱ نومبر ۲۰۱۴ء
۱۰۔''بنیاد''، لاہور، لمز، جلد نمبر ۷، ۲۰۱۶ء
۱۱۔تخلیق،لاہور،اکتوبر ۲۰۰۳ء
۱۲۔تخلیق،لاہور،دسمبر ۲۰۰۳ء
۱۳۔''تناظر'' ، گجرات ، شمارہ نمبر۲، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۲ء
۱۴۔''جناح'' (روزنامہ)، کراچی،۱۶ نومبر ۲۰۱۵ء

۱۵۔ خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ ،انڈیا، شمارہ ۱۶۲، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۰ء
۱۶۔'' خیابان''، پشاور، جامعہ پشاور، ۲۰۱۳ء
۱۷۔''روشنائی'' ، کراچی ، جلد ۱۵، شمارہ : ۶۵، اپریل تا جون ۲۰۱۶ء
۱۸۔''زیست''(منٹو صدی نمبر)، کراچی ، شمارہ نمبر ۴، نومبر ۲۰۱۲ء،
۱۹۔'' زیست'' ، کراچی ، شمارہ نمبر ۸،مئی ،جون ۲۰۱۵ء
۲۰۔'' سپوتنک''، لاہور ، جلد نمبر ۱۷، شمارہ نمبر ۵، مئی ۲۰۰۰ء
۲۱۔'' سپوتنک''، لاہور ، جلد نمبر ۱۴، شمارہ نمبر ۱۲، دسمبر ۲۰۰۳ء
۲۲۔''سپوتنک''، لاہور ، جلد نمبر ۱۶، شمارہ نمبر ۱، جنوری ۲۰۰۵ء
۲۳۔''سمبل''، راولپنڈی، جلد :۵، شمارہ :۱ تا ۴، جولائی ۲۰۱۰، تاجون ۲۰۱۱ء
۲۴۔''قند''، (مجید امجد نمبر)، مردان، جلد نمبر ۳، شمارہ نمبر ۸۔۹، مئی جون ۱۹۷۵ء
۲۵۔قومی زبان ، کراچی ، جولائی ۱۹۹۷ء
۲۶۔قومی زبان ، کراچی ، اکتوبر ۱۹۹۷ء،
۲۷۔قومی زبان''، کراچی ، اپریل ۱۹۹۹ء
۲۸۔قومی زبان''، کراچی، جلدنمبر ۲۷، شمارہ نمبر ۹، ستمبر ۲۰۰۰ء
۲۹۔''قومی زبان''، کراچی ، جلد نمبر ۷۸، شمارہ نمبر ۳، مارچ ۲۰۰۶ء
۳۰۔قومی زبان، ماہ نامہ۔کراچی،جلد ۸۲،شمارہ ۷،جولائی ۲۰۱۰،
۳۱۔'' قومی زبان''،کراچی، شمارہ نمبر ۵،مئی ۲۰۱۱ء
۳۲۔قومی زبان ،ماہ نامہ،کراچی،جلد ۸۷،شمارہ ۷
۳۳۔'' قومی زبان''،کراچی ، شمارہ نمبر ۷، جولائی ۲۰۱۵ء
۳۴۔قومی زبان ، کراچی ، جلد نمبر ۸۸، شمارہ نمبر ۷، جولائی ۲۰۱۶ء
۳۵۔''ماہ نو''، کراچی ، شمارہ نمبر ۵، جلد نمبر ۳، مئی ،۱۹۵۰ء
۳۶۔ ماہ نو (ماہ نامہ)لاہور،جلد ۶۷،شمارہ نمبر ۳ ،جولائی تا اگست ۲۰۱۳،
۳۷۔'' ملتان یونیورسٹی میگزین'' (دانائے راز نمبر)، ملتان ، ملتان یونیورسٹی ۷۸۔۱۹۷۷ء
۳۸۔''نیرنگِ خیال''،راولپنڈی ، جولائی ۲۰۱۳ء

۳۹۔'' ہم عصر''، ملتان، جلد :۲، شمارہ :۸ تا ۱۳، جنوری تا مارچ، ۲۰۰۰ء
۴۰۔'' ہم عصر''، ملتان، جلد نمبر۲، شمارہ نمبر۱۴ تا ۱۶، اپریل تا جون ۲۰۰۰ء
۴۱۔'' ہم عصر''، ملتان، شمارہ نمبر ۵، جولائی ۲۰۰۲ء

رسائل

۱۔ پاکستان ،روزنامہ،ملتان،۲۷ نومبر ۲۰۰۹
۲۔ جناح،روزنامہ ،کراچی،سوموار ۱۶ نومبر ۲۰۱۵،
۳۔ جنگ، روزنامہ، کراچی، مورخہ۱۳ فروری،۲۰۱۱ء
۴۔نوائے وقت ملتان ،مورخہ ۷ اگست ۱۹۹۷

مقالہ جات

۱۔مطہر شاہ،غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو ''اردو فنِ تحقیق پر مواد کا تحقیقی و توضیحی جائزہ، مخزونہ، قرطبہ یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خاں، ۲۰۰۹ء

لغات اورانسائیکلو پیڈیا

۱۔ جامع الغات : مولفہ : خواجہ عبدالمجید، لاہور، اُردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۹ء
۲۔ فرہنگ اصطلاحات ؛ جامع عثمانیہ، مرتبہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، اسلام آباد ،مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء
۳۔ قومی انگریزی اُردو لغت، ڈاکٹر جمیل جالبی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ،۱۹۹۲ء

۴۔ فیروز سنز ، اُردو انسائیکلو پیڈیا ،لاہور، فیروز سنز،۱۹۸۴ء

۵۔ اُردو جامع انسائیکلو پیڈیا ، لاہور،شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۷ء

1."The Dictionery of Modern Critical Terms" Roger Sowler, London, Paul, 1987 Routledge

2. "Dictionary of Literary Terms and Literary Theory" J. A.Cuddon, London, Penguin Books , 1992.

3. "New Websters Dictionary of English Language" U.S.A Delair Publishing Co.1986.

4." The Incyclopedia of Emericana"U.S.A Gollier NC , 1985

5."The New Incyclopedia of Britinica" U.S.A University of Checaigo , 1975.

6. "Collier Incyclopedia" London Mac Milan Educational Corporation,1977.